ہمارا معاشی نظام

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دارالعلوم کراچی

ہمارا معاشی نظام

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دارالعلوم کراچی

طبع جدید ــــ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ
باہتمام ــــ محمد قاسم
طباعت ــــ زم زم پرنٹنگ پریس
ناشر ــــ مکتبہ دار العلوم کراچی

ملنے کے پتے

مکتبہ دار العلوم کراچی

ادارۃ المعارف احاطہ دار العلوم کراچی

دار الاشاعت اردو بازار کراچی

ادارہ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی

بیت الکتب بالمقابل مدرسہ اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

فہرست مضامین

	صفحہ
ہمارا معاشی نظام	۹
اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات	۱۱
علماء کا متفقہ معاشی خاکہ	۴۱
ہمارے معاشی مسائل اور ان کے حل کی مختلف تجاویز	۵۳
سوشلزم اور غریب عوام	۷۵
اسلام، جمہوریت اور سوشلزم	۸۳
سوشلزم اور معاشی مساوات	۸۹
سوشلسٹ اعتراضات	۹۵
زرعی اصلاحات	۱۰۱

سود اور بینکنگ

سوالنامہ ربا کا جواب	۱۰۷
غیر سودی کاؤنٹرز	۱۳۱
بچت کا ہفتہ اور حکومت کی مالی اسکیمیں	۱۳۵
مشارکہ کی نئی اسکیم	۱۴۱
غیر سودی بینکاری، چند تاثرات	۱۴۵
سود کا مکمل خاتمہ	۱۵۳
بلاسودی بینکاری	۱۵۹
نیا بجٹ اور سودی اسکیمیں	۱۷۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حرف آغاز

عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کے اسلامی حل کے موضوع پر میں پچھلے تیئس سال سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں، اور ان میں سے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہو رہے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی احقر کو اسی موضوع کے دوسرے گوشوں پر بہت سے مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور احباب کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ ان نئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اگر اس کتاب میں ان مضامین کا اضافہ کیا جائے تو وہ بہت ضخیم کتاب ہو جائے گی، اور ایک تو ضخامت کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ مضامین سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، معاشرت اور انفرادی اصلاح وغیرہ کے مختلف ابواب پر منقسم ہیں۔ اور اتنی ضخیم کتاب کا حصہ بننے کا ایک نقصان یہ ہو گا کہ اگر کوئی صاحب ان میں سے صرف کسی ایک موضوع کے مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں تو انہیں یہ پوری ضخیم کتاب لینی پڑے گی جس کے بہت سے ابواب شاید ان کے لئے مفید مطلب نہ ہوں۔

اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان مضامین کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے بجائے ہر موضوع پر الگ الگ مجموعے تیار کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ چنانچہ احقر نے مندرجہ ذیل مختلف عنوانات قائم کر کے ہر عنوان پر ایک مجموعہ مضامین کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے:۔ (۱) نفاذ شریعت اور اس کے مسائل (۲) اسلام اور سیاست حاضرہ (۳) اسلام اور جدت پسندی (۴) ہمارا تعلیمی نظام (۵) فرد کی اصلاح (۶) سیرت طیبہ (۷) اصلاح معاشرہ (۸) ہمارا معاشی نظام (۹) مسلمان اور قادیانیت۔

ان نو مجموعوں میں سے اس وقت ایک مجموعہ "ہمارا معاشی نظام" پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے مفید بنائیں، اور یہ احقر کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

اسلام کا معاشی نظام

ہمارا معاشی نظام

کسی قوم کی معاشی حالت کو بہتر اس وقت کہا جاسکتا ہے جب اس کے تمام افراد کو زندگی کی تمام ضروریات فارغ البالی اور سکون و اطمینان کے ساتھ میسر ہوں، ملک کی پیداوار اور آمدنی اگر زیادہ ہو تو ملک کے تمام باشندے اس کی برکات سے مستفید ہوں، اور کسی کو تقسیم دولت کے معاملے میں کسی ناانصافی کی جائز شکایت نہ ہو۔ اس کے برخلاف اگر ملک کی ساری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور قوم کی اکثریت بھوک اور افلاس کا رونا رو رہی ہو، امیروں کے خزانے میں دولت کے انبار پر انبار لگتے چلے جائیں اور محنت کش عوام کی جیب سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ایک پیسہ سرک کر ختم ہو جائے تو خواہ ملک کی زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں۔ اسے ملک کی معاشی ترقی نہیں کہا جاسکتا، یہ وہ اجتماعی دیوالیہ پن ہے جس کی موجودگی میں کسی قوم کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہماری شومیٔ اعمال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال کچھ ایسی ہی بن کر رہ گئی ہے، اوپر اوپر سے دیکھیے تو ہم نے گذشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے، جب پاکستان بنا تھا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا، اور آج خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی یہ چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کر سکی، اس کے شب و روز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ ـــــ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دو سو سالہ

محکومی نے ہمارے دل و دماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کے بجائے آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھا دی تھی، زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے سرمایہ دار "حاکم" نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

سالہا سال تک اس طرز معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمداللہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے بھی ہم مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی ایسے حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور شور سے "سوشلزم" اور "اشتراکیت" کے نعرے لگا رہا ہے۔ حالاں کہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا۔ حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اس کے پاس تھا، نہ اس کے پاس ہے، وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے۔ مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں ــــ!

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ انسان "سرمایہ" کا خود مختار مالک ہے، روز مرہ کی ضروریات کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے، وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو قیمت چاہے مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے، اور ریاست اس کی ملکیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دو چار

ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں، لیکن یہ تصور اب بھی پوری طرح برقرار ہے کہ انسان سرمایہ کا "مالک" ہے اور چند قانونی حد بندیوں سے قطع نظر، سرمایہ سے سرمایہ پیدا کرنے کا ہر طریقہ اس کے لئے جائز ہے، اسی تصور کی بنیاد پر سود، قمار سٹہ اور اکتناز کو اس نظام میں شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے، اور یہ چیزیں اس نظام کے عناصر اربعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس نظام کے جو نتائج بد دنیا نے دیکھے، اور اب تک دیکھ رہی ہے، وہ یہ ہیں کہ معاشرے میں دولت کی گردش نہایت ناہموار اور غیر متوازن ہوتی چلی جاتی ہے، سرمایہ دار سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کے ذریعہ چاروں طرف ہاتھ مار کر روپیہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، اور دولت کے اس ذخیرے کے بل پر پورے بازاروں کا حکمراں بن بیٹھتا ہے، قیمتوں کو مصنوعی طور پر چڑھایا اور گرایا جاتا ہے، اور غیر ضروری بلکہ مضر اشیاء کو زبردستی معاشرے پر ٹھونسنے کے لئے ان کی فراوانی کر دی جاتی ہے، اور قوم کی حقیقی ضروریات کا مصنوعی قحط پیدا کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس نظام میں بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جب کہ معاشرے کے سینکڑوں افراد بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں۔ غلے اور اشیائے خورد و نوش کے لدے ہوئے جہاز جان بوجھ کر غرق کر دیئے جاتے ہیں، ان کے ذخیروں کو آگ لگا دی جاتی ہے تاکہ یہ اشیاء افراط کے ساتھ بازار میں آ کر سستے داموں ضرورت مند افراد تک نہ پہنچ سکیں، اور قیمتوں کا جو معیار سرمایہ دار نے مقرر کر لیا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کی اس کاروباری آنکھ مچولی میں ایک عام آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کی آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اور اس کی زندگی چند گنے چنے افراد کے ذاتی مفادات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے، دولت کے اس سمٹاؤ کا اثر پوری قوم کی صرف معیشت ہی پر نہیں، بلکہ اخلاق و کردار اور طرز فکر و عمل پر بھی پڑتا ہے، اور ملکی و بین الاقوامی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی

اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ان خرابیوں کو تو دیکھا، لیکن مرض کے اسباب کی ٹھنڈے دل و دماغ سے تشخیص نہ کر سکی اور معاملہ کی دوسری انتہا پر جا کھڑی ہوئی، سرمایہ داری نے کہا تھا کہ انسان بحیثیت فرد ذرائع پیداوار کا "مالک" ہے اشتراکیت نے کہا کہ کوئی فرد کسی ذریعہ پیداوار کا مالک نہیں، زمینوں اور کارخانوں کو جاگیر دار

اور سرمایہ دار کے تصرف سے نکال دو تو وہ بانس ہی نہ رہے گا جس سے ظلم کی بانسری بجتی ہے۔ اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ محنت کش عوام کے انتخاب سے ایک کمیٹی بناؤ، اور ملک کی تمام زمینیں اور ساری بنیادی صنعتیں انفرادی ملکیت سے نکال کر اس کے حوالے کر دو، یہ پارٹی ایک حکومت کی تشکیل کر کے ایک منصوبہ بند معیشت (PLANNED ECONOMY) کی بنیاد ڈالے گی، وہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ پھر وہی محنت کش عوام کو مختلف کاموں میں لگا کر پیداوار حاصل کرے گی اور وہ ہی اس حاصل شدہ پیداوار کو محنت کرنے والوں کے درمیان ایک خاص تناسب سے تقسیم کرے گی۔

یہ تجویز بڑے زور شور کے ساتھ پیش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طریق کار میں مزدور اور کسان کے ہر دکھ کا علاج ہے۔ لیکن نتائج پر غور کیجئے تو اس نظام معیشت نے نہ صرف یہ کہ کچھ نئی مشکلات کھڑی کر دیں، بلکہ مزدور کی پرانی مصیبتیں بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہیں، تھوڑی دیر کے لئے اس بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ اس تجویز کو عملی طور سے نافذ کرنے میں کتنی مشکلات ہیں؟ اس بحث کو بھی جانے دیجئے کہ یہ نظام شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے بغیر نہیں چل سکتا، اس پہلو کو بھی کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیجئے کہ اس سے بسا اوقات مزدور اور کسان کو اس کام پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو وہ اپنی افتاد طبع کے تحت نہیں کرنا چاہتا۔ اس واقعہ کو بھی بالائے طاق رکھئے کہ اس نظام میں "جبری محنت" اور "بیگار کیمپ" مزدور پر کیا ظلم ڈھاتے ہیں؟ اس بات کو بھی مت سوچئے کہ اس نظام میں مذہب و اخلاق کا کیا حشر ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام میں بھی ــــ جو خالص مزدور اور کسان ہی کے نام پر ابھرا ہے ــــ ملک کی دولت سے عام آدمی کو کتنا حصہ مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والی یہ پارٹی جس میں محنت کش عوام کے بمشکل پانچ فیصد افراد شریک ہوتے ہیں کوئی فرشتوں کی جماعت تو نہیں ہوتی، اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انفرادی سرمایہ دار کی نیت مزدور کے حق میں خراب ہو سکتی ہے تو اس پارٹی کی نیت کیوں خراب نہیں ہو سکتی؟ اگر ایک شخص بڑے کارخانے کا صرف مالک ہو کر اپنے زیر دستوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے تو یہ پارٹی ملک کی ساری زمینوں، سارے کارخانوں اور ساری دولت پر قابض ہو کر اپنے زیر دستوں کے حقوق پر کیوں ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو بیشک ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آ جاتا ہے جو دولت کی اس وسیع جھیل کو من مانے

طریقے سے استعمال کر سکتا ہے، چنانچہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ محنت کش عوام میں تقسیم ہوتا ہے اور باقی ساری دولت حکمراں جماعت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، بیرونی دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ اشتراکی ملک کی صنعت و تجارت دنیا پر چھا رہی ہے، وہاں مصنوعات اور ایجادات کی بہتات ہے اور وہاں کے مصنوعی سیارے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، لیکن اس بات کو سوچنے والے کم ہوتے ہیں کہ وہاں محنت کش عوام کو ان ترقیات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور دولت کے عظیم الشان ذخیروں میں سے انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے؟ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سرمایہ دار ممالک میں "ترقی" کا مطلب چند سرمایہ داروں کی ترقی ہے، اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی "ترقی" ایک خاص طبقے کی "ترقی" سے عبارت ہے۔ رہا بے چارہ عام مزدور اور کسان، سو وہ دونوں جگہ صرف اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے۔ جتنی اس کے "آقا" اسے دینا چاہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں اگر اسے اجرت کم محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال، احتجاج اور پیشے کی تبدیلی کے ذریعہ اپنے آنسو دھونے کی کوشش کر لیتا تھا، لیکن یہاں اسے اپنی کسی حق تلفی پر کراہنے کی بھی اجازت نہیں، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے اسی لئے کہا تھا

زمام کارگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کے برعکس اسلام کے عدل عمرانی کی شاہراہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے بیچ سے گذرتی ہے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز، خواہ زمین اور کارخانے کی شکل میں ہو، یا روپے پیسے اور اشیائے صرف کی شکل میں، اصل میں اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ملکیت میں۔ ، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لله ما فی السمٰوات و ما فی الارض (بقرہ)

آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔

ہاں وہ اپنی یہ ملکیت نفع اٹھانے کے لئے اپنے بندوں کو دے دیتا ہے۔

ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ (الاعراف)

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے۔

جب انسان کے ہاتھ میں ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اللہ کی

مرضی کا پابند ہو گا۔ اس کے ذریعہ دوسروں پر ظلم ڈھا کر زمین میں فساد برپا کر دینا اللہ کو کسی طرح گوارہ نہیں، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ دوسروں کا خون چوسنے کے بجائے اپنی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کو پیش نظر رکھ کر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

وابتغ فیما اٰتاك الله الدار الاٰخرة و لا تنس نصیبك من الدنیا و احسن کما احسن الله الیك و لا تبغ الفساد فی الارض (قصص)

"اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعے تم دار آخرت (کی بھلائی) تلاش کرو۔ اور دنیا سے جو حصہ تمہیں ملا ہے اسے نہ بھولو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم دوسروں پر احسان کرو، اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو"

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے انفرادی طور سے ملکیت عطا تو کی ہے لیکن یہ ملکیت، آزاد خود مختار خود غرض اور بے لگام نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے احکام کی پابند ہے، اس کو انسان اپنے جائز نفع کے لئے تو استعمال کر سکتا ہے، لیکن اس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی جتنی خرابیوں اور اس کی جتنی ناانصافیوں پر آپ نظر ڈالیں گے، بنیادی طور سے ان کے چار ہی سبب نظر آئیں گے۔ سود، قمار، سٹہ اور اکتناز، سرمایہ دار ایک طرف تو سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ ساری قوم کی دولت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، دوسری طرف اس کے کھانے میں کسی غریب، مفلس، اپاہج یا بے سہارا انسان پر لازمی طور سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی مد نہیں، وہ خود اپنی شرافت سے کسی کو کچھ دے دے تو اس کا احسان ہے، ورنہ ایسے، اخراجات کی کوئی پابندی اس پر نہیں ہے۔

اسلام نے اولاً تو آمدنی کے ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ سود، قمار، سٹہ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کو بدترین جرم قرار دے کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تاْکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارةً عن تراض منکم (بقرہ)

اے ایمان والوں! تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقے سے مت کھاؤ، الا یہ کہ تمہاری باہمی رضا مندی سے کوئی تجارت ہو۔

سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہو جائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے اور اگر نفع ہو جائے تو سارا نفع وہ لے اڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کے بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس کے بجائے شرکت و مضاربت کی صورت تجویز کی ہے جس میں نفع ہو تو فریقین کا ہو، اور نقصان ہو تو دونوں اسے برداشت کریں۔

قمار اور سٹہ میں بھی ساری قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے، پھر ایک عام آدمی کا ایک روپیہ یا تو اس جیسے ہزاروں غریب آدمیوں کی جیب سے ایک ایک روپیہ کھینچ کر اس کے پاس جمع کر دیتا ہے، یا خود بھی کسی سرمایہ دار کی جیب میں جا کر گرتا ہے۔ غرض دونوں ہی صورتوں میں روپیہ سمٹتا ہے اور اس کی فطری گردش رک جاتی ہے، اسلام نے اس پر اور کاروبار کے ایسے تمام طریقوں پر پابندی بٹھا دی ہے جن میں ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو یا جس سے پورے معاشرے کی دولت ایک جگہ سمٹنے لگے۔

آمدنی کے ناجائز ذرائع پر پابندی لگانے کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے سرمایہ دار پر زکوٰۃ جیسے بہت سے اخراجات واجب کر دیئے ہیں جو اس کا احسان نہیں، بلکہ اس مال پر واجب ہونے والا حق ہے۔ جسے بزور قانون وصول کیا جا سکتا ہے زکوٰۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقہ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت اور وراثت وہ چھوٹی بڑی مدات ہیں جن کے ذریعہ دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔

ان قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیت مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خود غرضی کے بجائے ہمدردی، فراخ حوصلگی، سخاوت اور سب سے بڑھ کر خوف خدا اور فکر آخرت پر استوار ہوئی ہے۔ اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے عائد ہونے والے قانونی فرائض کی ادائیگی پر بس کر لے اور اس کے بعد دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے، اس کو زندگی کے ہر مرحلہ پر تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یہ دنیا چند دنوں کی بہار ہے، عیش و مسرت روپے اور پیسے کے اس ڈھیر کا نام نہیں ہے جو یہاں جمع کر لیا جائے، بلکہ روح کے اس سکون اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جو اپنے کسی بھائی کے چہرے پر خوش حالی کی مسکراہٹ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے، اور جس سے آخرت کی

آنے والی زندگی میں مسرتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔

چنانچہ قرآن و حدیث کو دیکھئے، ان کی تعلیمات "انفاق فی سبیل اللہ" کی ہدایت سے بھری پڑی ہیں، اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ

یسئلونك ما ذا ینفقون قل العفو (بقرہ)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو

غرض ایک طرف سرمایہ دار کی آمدنی کی ناجائز مدات کو ختم کر کے اور دوسری طرف اس کے اخراجات میں اضافہ کر کے اسلام نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے، افسوس ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ساری باتیں نرا "نظریہ" ہو کر رہ گئی ہیں، اور عملی طور سے معیشت کا یہ بے داغ اور صاف ستھرا نظام دنیا میں کہیں نافذ نہیں ہے، لیکن اگر اس نظام کے عملی نتائج دیکھنے ہوں تو تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیجئے، جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لے کر نکلا کرتا تھا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

اب ہماری شو مئی اعمال ہے کہ اتنا پر امن و سکون معاشی نظام رکھنے کے باوجود شروع میں تو ہم نے اپنی معیشت کا نظام سرمایہ داری کے اصولوں پر بنایا۔ اب جب کہ اس کے نقصانات سامنے آرہے ہیں تو ہم میں سے بعض لوگوں نے "اشتراکیت" اور "سوشلزم" کی آوازیں بلند کرنی شروع کر دی ہیں پہلے سرمایہ داری کی بدترین لعنتوں اور سود اور قمار وغیرہ کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن و سنت کی تحریف کی جاتی تھی، اب سوشلزم کو "اسلامی" بنانے کے لئے آیات و احادیث کی الٹی سیدھی تاویلیں کی جارہی ہیں، اور ذہن اگر نہیں چلتا تو اس طرف کہ مغربی افکار کی غلامی کو ایک مرتبہ دل سے نکال کر سیدھے سچے طریقے سے اسلامی اصولوں پر غور کر لیا جائے کہ وہ موجودہ معاشی مشکلات کا واقعی طور سے کیا حل پیش کرتے ہیں۔

جو حضرات غلط فہمی سے سرمایہ داری یا اشتراکیت کو اپنے لئے راہ نجات سمجھ بیٹھے ہیں، ہم نہایت درد مندی کے ساتھ ان سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام میں اسلام کا پیوند لگانے کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے معقولیت کے ساتھ اسلامی احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک آزاد اسلامی مملکت میں مسلمان کا حقیقی منصب یہ ہے کہ وہ پرائے

شگون پر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے نہ صرف خود اسلام کا عملی نمونہ بنے بلکہ دنیا بھر کو دعوت دے کہ تم افراط و تفریط کی کس بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہو. انسانیت کی فلاح کی منزل اس راستے پر چلے بغیر ہاتھ نہیں آ سکتی جو چودہ سو سال پہلے انسانیت کے محسن اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھا دیا تھا۔

بمصطفیٰ برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی، تمام بولہبی است

اسلامی نظام کے تحت
معاشی اصلاحات

آج کل یہ سوال عام ہے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام جس کو پوری انسانیت کے لئے امن و اطمینان کا ضامن بتلایا جاتا ہے، وہ نظام کیا ہے؟ اور اس کے ذریعہ ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اصل بات تو یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کوئی خالص نظری فلسفہ نہیں ہے جسے کبھی دنیا نے عملی زندگی میں دیکھا اور برتا نہ ہو، بلکہ یہ نظام سینکڑوں سال تک دنیا میں عملی طور پر نافذ رہا، اور اس کی یہ برکتیں ہر دور اور ہر ملک میں ہر شخص نے مشاہدہ کی ہیں کہ جب کسی جگہ یہ نظام رائج ہوا وہاں ان معاشی ناانصافیوں کا نام و نشان نہیں رہا جن سے آج کی دنیا بے چین ہے۔ وہاں غریب و امیر کی جنگ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا، وہاں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے تھے، وہاں مزدور اور کسان حقیر وذلیل نہیں تھا، اس کی ایسی ہی عزت کی جاتی جیسی برادری کے دوسرے افراد کی، وہاں صنعت اور تجارت پر اجارہ داریاں نہیں تھیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت بڑے سرمایہ داروں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے وہاں ان تمام دروازوں کو بند کر دیا گیا تھا جن کی وجہ سے "بڑے لوگ" اشیاء صرف کی قیمتوں پر حاکم بن کر بیٹھ جائیں گرانی غریبوں کی کمر توڑتی رہے اور غریب عوام مصنوعی قحط کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

؎ یہ مقالہ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کا ہے جو سب سے پہلے البلاغ کے اداریہ پھر کتابی شکل میں شائع ہوا، پھر اسی مقالے کی تجاویز ۱۸ علماء کی طرف سے حکومت کو پیش ہوئیں۔

پھر یہ نظام ایسا بھی نہیں ہے کہ سینہ بہ سینہ ہی چلا آیا ہو۔ اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں، علم فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ اسلام کے معاشی قوانین ہی پر مشتمل ہے۔ اور بہت سے لوگوں نے ان احکام کو قانونی دفعات کی شکل میں بھی مدون کر دیا ہے، مگر اس کا علاج کس کے پاس ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے دین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت اور توانائی کا ہزارواں حصہ بھی خرچ نہ کریں، کبھی قرآن، حدیث اور فقہ کو سنجیدگی کے ساتھ نہ پڑھیں، اور جب کوئی شخص "اسلام کے معاشی نظام" کا نام لے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ یہ کوئی نئی اصطلاح ہے جس کا نہ کوئی مفہوم ہے، اور نہ ماضی میں اس کا کوئی عملی وجود قائم ہوا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے اس وقت یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں جس اسلامی نظام کو علماء دین سب سے بہتر کہتے ہیں وہ آخر ہے کیا؟

اس کا مکمل جواب تو یہی ہے کہ اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھئے، ہر ہر جز کی تفصیلات سامنے آجائیں گی، لیکن یہ معلوم ہے کہ فی الوقت یہ سوال کوئی خالص علمی حیثیت کا سوال نہیں جس کو فرصت کے اوقات میں حل کیا جا سکے، بلکہ یہ ملک کے ہنگامی حالات کا پیدا کیا ہوا سوال ہے جس کا مختصر جواب جلد سے جلد سامنے آجانا چاہئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں نمونہ کے طور پر اسلام کے معاشی نظام کی چند بنیادی خصوصیات پیش کر رہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اگر ہمارے ملک میں صحیح اسلامی نظام رائج ہو تو اپنی معیشت کے موجودہ ڈھانچے میں ہمیں کون سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی؟ تقسیم دولت کے موجودہ نظام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اور ان کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیوں کر پیدا ہو سکے گی؟

اس وقت ہمارا سب سے بڑا معاشی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے، عوام کی سب سے اہم اور معقول شکایت یہ ہے کہ ملک کی معاشی ترقی سے چند گنے چنے خاندان نہال ہو رہے ہیں، اور عام آدمی فقر و افلاس کا شکار ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی ستائی ہوئی دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے آج کل "سوشلزم" کا نسخہ پیش کیا جا رہا ہے، لیکن ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال کا علاج سوشلزم کے پاس نہیں ہے، اور یہ علاج صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔

غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی معاشی پریشانی کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں، آمدنی کی کمی اور گرانی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی۔ اور ان دونوں اسباب کی ذمہ

داری ہماری معیشت کے اس سرمایہ دارانہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے پوری قوم کی دولت کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اسلامی کا نظام معیشت نافذ ہو تو مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جائیں گی۔

○ صنعتی اجارہ داریاں جو کارٹیل وغیرہ کی شکل میں رائج ہیں، ان سب کو ممنوع قرار دے کر آزاد مسابقت کی فضا پیدا کی جائے تاکہ ناجائز منافع خوری کا انسداد ہو سکے۔ اس وقت ان صنعتی اجارہ داریوں کی وجہ سے پورا بازار چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، اور وہی قیمتوں کے نظام کو اپنی طبعی رفتار سے ہٹا کر گرانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں تو منافع کی جو زائد مقدار سرمایہ داروں کے پاس جا رہی ہے اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے۔

○ کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کئے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو، یا جن کا بینک بیلنس پانچ ہزار روپے سے کم ہو، اور اب تک اس قسم کی صنعتوں میں اس سے زائد آمدنی یا بینک بیلنس والے جن افراد کے حصص ہیں، ان کے ساتھ سال کے ختم پر شرکت کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔

یہ طریقہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے کہ صنعتوں کے قومی ملکیت میں چلے جانے سے صنعتیں غریبوں کی ملکیت میں نہیں آتیں، بلکہ ان پر سرکاری افسروں کا تسلط

قائم ہو جاتا ہے، اس کے بجائے اس صورت میں غریب عوام براہ راست صنعتوں کے مالک ہوں گے اور ان پر نہ سرمایہ داروں کا تسلط ہوگا نہ حکومت کا۔

○۔(۳) سود ارتکاز دولت کا سب سے بڑا سبب ہے، قوم کے لاکھوں افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اس سودی نظام کی وجہ سے سارا کا سارا ان چند سرمایہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے جو بینک سے لاکھوں روپیہ قرض لے کر بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں اور عوام کو نہایت معمولی سی رقم سود کی شکل میں ملتی ہے۔ اور چوں کہ سرمایہ دار نفع کی اتنی بھاری مقدار حاصل کر کے بازار کے حکمراں بن جاتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ معمولی سی رقم بھی بالآخر مزید کچھ سود لے کر ان ہی سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً کراچی میں روئی کی لاکھوں گانٹھیں آتی ہیں، اور یہ ساری گانٹھیں صرف چند تاجر خریدتے ہیں جن کو بینک کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اپنے روپے سے گانٹھوں کا کروبار کرنے والا ایک بھی نہیں ہے۔

اسلامی نظام قائم ہو تو یہ ظالمانہ نظام ختم ہو کر بینکاری کا نظام سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے گا جس کے نتیجے میں بینک میں روپیہ جمع کرنے والے عوام بینک کے جمع شدہ سرمائے کے نفع میں شریک ہوں گے اور اس سے دوطرفہ فائدے ہوں گے۔ ایک طرف بازار پر سے چند افراد کا تسلط ختم ہوگا اور اس سے ارزانی پیدا ہوگی، دوسری طرف منافع کے حصے دار بہت زیادہ ہوں گے اور بڑی بڑی تجارتوں کا متناسب منافع بینکوں کے واسطے سے عوام تک پہنچے گا۔ اور دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے گی۔

بینکاری کے نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلانے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کی تفصیلات متعدد علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہیں اور بینکاری کے ماہرین نے انہیں قطعی طور پر قابل عمل اور زیادہ مفید قرار دیا ہے (اس نظام کا ایک خاکہ انشاء اللہ عنقریب الگ شائع کر دیا جائے گا)

○۔ (۴) اشیاء کی گرانی اور سرمایہ کے ارتکاز کا دوسرا بڑا سبب ہمارے معاشرے میں "سٹہ" کی اندھی تجارت ہے، سٹہ کی مفصل خرابیاں بیان کرنے کے لئے تو ایک مستقل مقالہ چاہئے، ایک مختصر مثال یہ ہے کہ اس کاروبار کی وجہ سے مال کے ذخیرے ابھی بازار کے قریب بھی نہیں آنے پاتے کہ اس پر سینکڑوں سودے ہو جاتے ہیں، ایک تاجر مال کا آرڈر دے کر مال کی روانگی سے پہلے ہی اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے ہاتھ اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ۔ یہاں تک کہ جس وقت مال بازار میں پہنچتا ہے تو وہ بعض اوقات خرید وفروخت کے سینکڑوں معاملات سے گزر چکا ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بازار تک پہنچتے پہنچتے اس کے دام کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں، بیس روپیہ کی چیز پچاس ساٹھ روپے میں بکتی ہے۔ یہ سارا نفع سٹہ باز لے اڑتے ہیں اور عوام کی جیب خالی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں اس اندھے کاروبار کی گنجائش نہیں، اسلام میں مال کے قبضے سے پہلے اسے بیچنا ناجائز ہے، لہٰذا اسلامی نظام قائم ہوا تو سٹہ کا یہ سارا کاروبار ممنوع ہو جائے گا جس سے اشیائے صرف لازمی طور پر سستی ہوں گی اور منافع کی وہ زائد مقدار جو اس اندھے کاروبار کی وجہ سے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے، اس سے غریب عوام مستفید ہو سکیں گے۔

○۔ (۵) ہمارے موجودہ نظام معیشت میں ارتکاز دولت کا تیسرا سبب "قمار" ہے انشورنس کا پورا نظام اسی قمار پر قائم ہے، اس کے علاوہ گھوڑوں کی ریس معمہ بازیاں، انواع و اقسام کی لاٹریاں، کھیل تماشوں کے سیزن ٹکٹ، یہ سب قمار کی وہ ہلاکت آفریں اقسام ہیں جن کی زد سب سے زیادہ غریب عوام پر پڑتی ہے، اور ان کے ذریعہ غریب عوام کی کمائی کا ایک ایک روپیہ جمع ہو کر کسی ایک فرد پر ہن برسا دیتا ہے اور باقی سب لوگ دیکھتے، رہ جاتے ہیں، اسلامی حکومت میں

قمار کی یہ تمام صورتیں ممنوع ہوں گی، اور عوام کو بے وقوف بنانے کے یہ دروازے بند ہو جائیں گے۔

انشورنس کے موجودہ نظام میں انشورنس کمپنیوں کے جمع شدہ سرمائے سے سب سے زیادہ فائدہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے جو آئے دن مختلف حادثات کے بہانے رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، غریبوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ گویا اس طریقے سے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے جانی و مالی نقصانات کی ذمہ داری بھی ان غریب عوام پر ڈال دیتے ہیں جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اس طریقے کو بدل کر اسلامی حکومت "امداد باہمی" کی ایسی انجمنیں قائم کرے گی جو سود اور قمار سے خالی ہوں اور جن سے غریب عوام زیادہ بہتر طریقے سے مستفید ہو سکیں گے۔ (اس کی عملی اسکیمیں بھی علماء کی طرف سے شائع کی جا چکی ہیں اور انشا اللہ عنقریب انہیں الگ منظر عام پر لایا جائے گا)

○ـ (۶) ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر بدنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنے ذخائر بازار میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔

○ـ (۷) لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل ہو یہ رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کو اس ظالمانہ طریق کار سے آزاد کر دیا جائے تو اشیائے صرف خود بخود سستی ہو جائیں گی اور ایک عام آدمی بھی معمولی سرمایہ کے ذریعہ تجارت

وصنعت میں داخل ہو سکے گا۔ اور آج کا مزدور کل کا کارخانہ دار بن سکے گا۔

(۸) موجودہ نظام میں تنخواہوں کا معیار نہایت غیر منصفانہ اور مختلف درجات کا باہمی تفاوت بہت زیادہ ہے، اس تفاوت کو کم کر کے مناسب سطح پر لایا جائے گا۔

(۹) ہمارے یہاں مزدوروں کی اجرت کی سطح بہت پست ہے، ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچ افراد پر مشتمل ایک اوسط درجے کا خاندان کا کم از کم خرچ دو سو بیس روپے ہے اور مشرقی پاکستان میں دو سو ساٹھ روپے لیکن اجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پست ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں اور مختلف صنعتوں میں کم از کم تنخواہ بہتر روپیہ سے لے کر ایک سو سترہ روپیہ تک رہی ہے، اور نئی لیبر پالیسی میں زائد سے زائد مقدار ایک سو چالیس روپیہ مقرر کی گئی ہے، لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں یہ تنخواہ بھی ناقابل اطمینان ہے، اور اس میں حقیقت پسندانہ اضافے کی ضرورت ہے۔ اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اجرتوں کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے جو مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور صنعتی نظام کے لئے قابل عمل بھی، اس کی تعین کے لئے مزدوروں آجروں اور حکومت کے مساوی نمائندگان پر مشتمل اجرت بورڈ ہونا چاہئے جو بدلتے ہوئے حالات میں اجرتیں تبدیل کرنے کا مجاز ہو، کم از کم شرح متعین کرنے کے بعد اجرتوں کی مزید مقدار مزدوروں کی قوت معاملہ (BARGNING POWER) پر چھوڑ دی جائے۔

(۱۰) آجروں کے ساتھ مزدوروں کے معاملے میں یہ شرط بھی حکومت کی طرف سے عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر یا خاص مدت میں یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضے کے طور پر ان کو نقد بونس دینے کے بجائے کسی مخصوص کارخانے کے شیئرز مالکانہ حیثیت میں دے دیں۔ اس طرح مزدور

کارخانوں میں حصہ دار بن سکیں گے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مزدوروں کی اجرت میں یہ اضافہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے کہ جب کہ ان کے لئے صنعتی اجارہ داریوں کو توڑنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدامات بھی کئے جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ورنہ اجرتوں کی زیادتی سے قیمتیں بڑھ جائیں گی اور سرمایہ دار جو رقم ایک جانب سے مزدور کو دے گا وہ دوسری طرف سے وصول کر لے گا۔ اور مزدور کی مشکلات حل نہ ہو سکیں گی۔

○ (۱۱) مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے۔ جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریات زندگی کی معقول کفالت بھی کر سکے اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم ہونا چاہئے جس میں کسانوں، زمینداروں اور حکومت کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

○ (۱۲) مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم و ستم زمینداروں کی طرف سے کسانوں پر ہوتے ہیں، ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں، بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کر دیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں۔ ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم و رواج کے ذریعہ ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

○ (۱۳) مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم و رواج نے جکڑ لیا ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں، اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب

زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں، یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشتکار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے۔ اس اجرت کی تعیین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشتکاروں کو دیں گے۔

○ (۱۴) احیاء اموات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں، یعنی جو کاشت کار غیر مملوکہ غیر آباد بنجر زمینوں کو خود آباد کریں گے ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں، جو زمینیں جاگیرداروں کو آباد کرنے کے لئے دی گئیں، اور انہوں نے ان کو خود آباد کرنے کے بجائے کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیا تو وہ کاشتکاروں کی ملکیت ہو گئیں، کاشت کاروں کو ان پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور پیداوار کا جو حصہ جاگیر داروں نے وصول کیا وہ واپس لیا جائے۔

○ (۱۵) زمینوں کے رہن کے جتنے سودی طریقے رائج ہیں، ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اور جو زمینیں اس وقت ناجائز طریقوں سے زیر بار ہیں ان سب کو چھڑا کر ان کے غریب اور مستحق مالکوں کو لوٹایا جائے۔ اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے، اس کرائے کو قرض میں محسوب کیا جائے، اور اگر کرایہ کی رقم قرض سے زیادہ، ہو تو وصول کر کے قرض دار کو دلوائی جائے۔

○ (۱۶) ہمارے ہیاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوئی اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان کے شرعی مستحقین میں تقسیم کرے۔ اگر اسلام کا قانون وراثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

- (۱۷) انتقال جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- (۱۸) کاشتکاروں کے لئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔
- (۱۹) کاشت کاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کئے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔
- (۲۰) زرعی امداد باہمی کی تحریک میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔
- (۲۱) ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہو کر گذرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (MIDDLE MEN) کی بہتات سے دو طرفہ نقصان ہوتے ہیں، ایک طرف کاشتکاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث کی رو سے اسلام میں دیہی کاشتکار اور شہری خوردہ فروش کے درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا۔ اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظم بازار (Organised Masleits) کافی تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشت کار خود بلا واسطہ پیداوار کو فروخت کر سکیں، یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کے لئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشت کاروں پر مشتمل ہوں اور یہ انجمنیں پیداوار فروخت کریں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشت کار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔
- (۲۲) نفقات کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام و کمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی

کفالت اسلام نے خاندان کے کشادہ دست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔

○ (۲۳) زکوٰۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے:۔

الف:۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوٰۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

ب:۔ ہر سال مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کر کے اسے غریبوں میں تقسیم کرے۔

ج:۔ سونے چاندی کی سالانہ زکوٰۃ اور زرعی پیداوار کا عشر مالکان خود ادا کریں گے۔ لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے کہ انہوں نے زکوٰۃ اور عشر ادا کیا ہے یا نہیں؟

○ (۲۴) ملک کے ہر باشندے کے لئے روز گار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور کوشش کے باوجود جو افراد بے روز گار رہ جائیں ان کے لئے روز گار کی فراہمی تک "بیروز گاری الاؤنس" جاری کئے جائیں۔

○ (۲۵) حکومت کی طرف سے ایک "فلاحی فنڈ" قائم کیا جائے، اور اس فنڈ کے لئے سالانہ بجٹ میں مستقل رقم رکھی جائے اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں اضافہ کیا جائے۔ اس فنڈ کے ذریعے بھاری صنعتیں بھی قائم کی جا سکتی ہیں تاکہ اس رقم کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہو اور ان کے منافع سے "فنڈ" میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔

اس فنڈ کے ذریعہ عام غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کے لئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کئے جائیں، کثیر تعداد میں مفت شفاخانے قائم کئے جائیں، بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے۔ اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے

لئے دوسرے اقدامات کئے جائیں۔

○ (۲۶) کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بیہودہ یا مخرب اخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف بیجا سے پرہیزنہ کرے۔ یوں تو فضول خرچی انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے، لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی ملکیت ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ فضول خرچی قومی خزانے میں ہوتی ہے۔ ہر سال خزانے کا بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ شاہانہ تقریبات، سرکاری دوروں، سرکاری عمارتوں کے سامان تعیش اور زینت و آرائش کے بہانے قطعی بے فائدہ اور فضول خرچ ہوتا ہے، ان خراجات کو قطعی طور پر بند کرنا تو ممکن نہیں، لیکن ان مقاصد کے لئے جس بے دردی کے ساتھ قومی روپیہ بہایا جاتا ہے، اس کا کوئی شرعی، عقلی اور معاشی جواز نہیں ہے، بسا اوقات ایک ایک دعوت پر ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ اور اگر حساب لگایا جائے تو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یقیناً اربوں روپیہ ان فضول خرچیوں میں صرف ہوا ہے۔ اسلامی نظام میں قومی دولت کے اس ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا تقریبات اور سرکاری دوروں کے لئے اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کر کے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے۔ اور اس طرح جو خطیر رقمیں بچیں انہیں "فلاحی فنڈ" میں داخل کیا جائے۔

○ (۲۷) قومی دولت کی ایک بہت بڑی مقدار آج کل ان مقاصد پر صرف ہو رہی ہے جو شرعی طور پر حرام اور ناجائز ہیں، مثلاً شراب، فلموں اور دوسری حرام اشیاء کی درآمد پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے زرمبادلہ کے اس زبردست نقصان کو بالکلیہ بند کیا جائے اور اس خطیر رقم کو عوامی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ غیر مسلموں کو شراب استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن درآمد کرنے کی

نہیں۔

(۲۸) خاندانی منصوبہ بندی کی خالص احمقانہ تحریک نے بھی ہماری معیشت کو نقصان پہنچایا ہے، تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس تحریک کے فروغ کے لئے ۲۸۴ ملین روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے (جب کہ سماجی بہبود کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم کل ۱۳۵ ملین ہے) یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی شرعی، عقلی، سماجی، معاشی غرض ہر اعتبار سے پاکستانی عوام کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اس صورت میں قومی دولت کا اتنا بڑا حصہ اس پر صرف کرنے کے بجائے زراعت کی ترقی اور کاشت کاروں کی پیداوار بڑھانے پر صرف کیا جائے۔

انتظامیہ کی اصلاح:۔ قانون اور رواج میں مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ ہمیں اپنے انتظامی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے، ہمارے، معاشرے میں استحصال کا ایک بڑا سبب انتظامی خرابیاں بھی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہمارا قانون بالکل درست ہے اور اگر اس پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو ان خاص معاملات میں انصاف حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری انتظامی مشینری اس قدر ناقص، از کار رفتہ، سست، اور ڈھیلی ڈھالی ہے کہ قانون صرف کتابوں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے۔ اور عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ کی صورت حال یہ ہو تو ملک کا قانون کتنا ہی بے داغ کیوں نہ ہو، اس کے اچھے نتائج سامنے نہیں آ سکتے۔ لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لئے انتظامیہ کو ایمان دار مضبوط، فعال اور قابو یافتہ بنانا قانون کے مؤثر ہونے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں مکمل طور سے تو انتظامیہ (ADMINISTRATION) کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں، اور قوم کی تعمیر نو کے وقت ان ہی کی خدمات سے انتظامیہ کی اصطلاح کی جا سکے گی، لیکن ہم یہاں چند سامنے کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ نظم و ضبط کی ابتری کس بری طرح ہمارے عوام کے لئے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

(۱) "رشوت" ایک ایسا جرم ہے جو شاید کسی بھی نظام حیات میں جائز نہ ہو، ہمارا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آکر دیکھئے تو وہی رشوت جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جا رہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک اسے شیر مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے۔ اور جس کی جیب خالی ہو وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورت حال کو مضبوط اور ایمان دار انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے، اگر اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرتناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لئے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔

(۲) ہمارا عدالتی نظام اس قدر فرسودہ، پیچیدہ، دشوار گزار اور تکلیف دہ ہے کہ ایک غریب آدمی کے لئے ظلم پر صبر کر لینا داد رسی کے بہ نسبت زیادہ آسان ہے، اس کے لئے یوں تو پورے عدالتی اور اس کے دیوانی و فوج داری ضابطوں کی تشکیل نو ضروری ہے۔ لیکن خاص طور سے مندرجہ ذیل اقدامات فوری طور پر ضروری ہوں گے۔

(الف) صنعتی تنازعات کے تصفیئے کے لئے عدالتیں قائم کی جائیں جن تک پہنچنا مزدوروں کی براہ راست دسترس میں ہو اور جن کا طریق کار آسان ہو۔

(ب) زمینداروں اور کاشت کاروں کے تعلقات کی نگرانی اور کاشت کاروں کو ناجائز شرائط کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بھی سرسری عدالتیں قائم کی جائیں۔

(ج) عورتوں پر ہونے والے مظالم کی داد رسی کے لئے گشتی عدالتیں قائم کی جائیں جو سرسری طور پر مقدمات فیصل کریں۔

(۳) مزدوروں کی صحت، حادثات سے تحفظ، غیر معمولی محنت سے بچاؤ اور تنخواہوں کے معیار وغیرہ سے متعلق فیکٹریز ایکٹ اور دوسرے لیبر قوانین میں کافی احکام موجود ہیں، لیکن کارخانوں کی عملی تحقیق کیجئے تو ان قوانین کا کوئی اثر وہاں مشکل ہی سے نظر آتا ہے فیکٹریز ایکٹ کے تحت کارخانوں میں ہوا، روشنی، صفائی، موسمی اثرات سے حفاظت اور دوسرے حفاظتی

انتظامات ضروری قرار دیئے گئے ہیں، اور ان کی نگرانی کے لئے فیکٹری انسپکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ متعلقہ فیکٹری انسپکٹر کا ماہانہ "وظیفہ" کارخانوں کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ انسپکٹر سال بھر میں چند برائے نام چالان کر کے اپنی کارکردگی دکھا دیتا ہے اور چند سو روپے جرمانے کے طور پر سرکاری خزانے کو پہنچ جاتے ہیں، رہا بیچارہ مزدور سو اس کو فیکٹریز ایکٹ کی کسی دفعہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جن مقامات پر وہ کام کرتا ہے، وہ جاڑوں میں سخت ٹھنڈے اور گرمیوں میں نہایت گرم ہوتے ہیں، طعام خانے میں انتہائی مضر صحت اشیاء فروخت ہوتی ہیں، بیت الخلاء اس قدر گندے اور ناکافی ہوتے ہیں کہ فیکٹریز ایکٹ دیکھتا رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ ایسی ہی "چست" اور دیانت دار ہو تو کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کارگر نہیں ہو سکتا۔

(۴) "سرخ فیتے" کی مصیبت ہمارے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور اس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے اپنی کسی ضرورت کے تحت دفتری کاموں سے سابقہ پڑا ہو۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ جو شخص وسائل و اسباب اور تعلقات نہ رکھتا ہو وہ اپنے جائز حقوق آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے کاموں کے لئے محکموں اور اداروں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک محکمے پر قومی دولت کا مستقل حصہ صرف ہو رہا ہے، لیکن ہر محکمے میں فائلوں کے انبار لگے پڑے ہیں اور کام نبٹنے میں نہیں آتا۔

انتظامیہ کی ابتری کی چند مثالیں صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہیں کہ نظم و ضبط کے فقدان کا براہ راست اثر عوام کی معیشت پر پڑ رہا ہے، اور قانون کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جب تک انتظامیہ کو مستحکم اور فعال نہیں بنایا جائے گا، عوام کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

سادہ معاشرت کا رواج:۔ معاش کے سلسلے میں عوام کی پریشانیوں کا تیسرا اہم سبب وہ مغربی معاشرت ہے جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہے، اسلام ہمیں سادہ طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر ہمارے ملک پر آسمان سے ہن برسنے لگے تب بھی ہمیں تکلف اور تعیش کی زندگی سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے اگر اسلامی نظام قائم

ہو تو ہمیں اپنی معاشرت میں مندرجہ ذیل اصلاحات کرنی ہوں گی:۔

(۱) رہن سہن کے پر تکلف، عیش پرستانہ اور مہنگے طریقے یکسر چھوڑ دینے ہوں گے جو ہم نے مغرب سے در آمد کئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں، اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے لباس اپنی وضع قطع، اپنے طرز رہائش، اپنی تقریبات غرض معاشرت کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ اور اس احمقانہ تقلید کو تہذیب کی علامت سمجھے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک شخص اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ دو ڈھائی سو روپے کا اپٹوڈیٹ سوٹ نہ پہنے ہوئے ہو، اس کے پاس جدید ترین آسائشوں والا بنگلہ نہ ہو، اس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر نہ ہو اور اس کے گھر میں ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن نہ لگا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب یہ چیزیں تہذیب کی شرط لازم قرار پائی گئی ہیں تو لوگوں کا شب و روز ان کے حصول میں کوشاں رہنا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے، اور اس غرض کے لئے جب محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیتا ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے حکام، وزراء، سیاسی رہنما اور سماجی کارکن سادہ طرز معیشت اختیار کرنے کی ملک گیر تحریک چلائیں، اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں اس لئے کہ جب تک ہمارے اعلیٰ حکام، دولت مند افراد اور سیاسی رہنما اپنے لباس، اپنی نشست و برخاست، اپنی تقریبات اپنے طرز رہائش اور اپنی عام زندگی میں سادگی کو نہیں اپنائیں گے، عوام تکلّفات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات نہیں پا سکیں گے جو ان کی معاشی بدحالی کا بڑا سبب ہے۔ اور جس کا نتیجہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) سامان تعیش کی در آمد بالکل بند کر دی جائے اور تمام اشیائے صرف میں ملک کی اپنی پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

(۳) جو اشیائے صرف ایسی ہیں کہ وہ پاکستان میں متوسط یا اعلیٰ معیار کی پیدا ہونے لگی ہیں (مثلاً کپڑا) ان کی در آمد پر بھی پابندی عائد کر دی جائے تو عوام میں سادگی کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی اور زر مبادلہ میں بھی کفایت ہو گی۔

(۴) شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ پر اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کر دی جائے

جس سے زائد خرچ کرنا قانوناً جرم ہو۔

(۵) بعض صنعتیں اور کاروبار ایسے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں، اور آج ان کو بند کرنے کا تصور بڑا نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ ان کی برائی کو جاننے بوجھنے کے باوجود انہیں بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں، لیکن اگر اپنے مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کرنا ہے تو ہمیں اس جھجک کو ختم کر کے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کرنے ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی نامانوس اور اجنبی کیوں نہ معلوم ہوں۔ مثلاً فلم انڈسٹری اور ٹیلی ویژن ایسے ادارے ہیں جنہوں نے قوم کو اخلاقی تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے، جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس صنعت نے قوم کو نقصان ہی نقصان پہنچایا ہے۔ جس قوم کی نوے فیصد آبادی فقر و افلاس کا شکار، تعلیم و تربیت سے محروم اور فن و ٹیکنیک میں پسماندہ ہو، اس کے لئے آخر کیسے جائز ہے کہ وہ اپنا کروڑوں روپیہ سالانہ ان کھیل تماشوں پر صرف کر دے جو صحت، اخلاق اور ذہنی پاکیزگی کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہے ہیں، جو مالی اور انسانی وسائل اس وقت اس قسم کی چیزوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں موجودہ حالت پر برقرار رکھنا ”گھر پھونک تماشا دیکھنے“ کے مترادف ہے۔ اگر انہیں کسی ایسی صنعت پر لگایا جائے جو قوم کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہو تو ہمیں معاشی ترقی میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اسلام صحت مند تفریح کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تفریح کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کا حاصل صحت، اخلاق اور پیسہ کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسی مفید اور صحت مند تفریح کو فروغ کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے لئے مفید ہوں، یا کم از کم مضر نہ ہوں؟

(۶) ہمارے معاشرے میں پیشے کی بنیاد پر جو سماجی طبقات پائے جاتے ہیں، اور جس طرح انہیں عزت و ذلت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی سراسر غیر اسلامی تصور ہے جو ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔ یہ چیز اسلام کی معاشرتی مساوات کے تو قطعی خلاف ہے ہی، اس کا معاشی نقصان بھی یہ ہے کہ سماجی تقسیم محنت کی آزاد نقل پذیری (MOBILITY) میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ محنت کی آزاد نقل پذیری کے بغیر متوازن معیشت کا قیام مشکل ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح نظام تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت کے ذرائع اور سماجی تحریکات کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔

(۷) ملازموں، مزدوروں اور کسانوں کا سماجی رتبہ (SOCIAL STATUS) بلند

کرنے کی شدید ضرورت ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے مزدور اور آجر ایک ہی برادری کے دو فرد ہیں جو اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آجر اپنے عام رویہ میں مزدور کو کمتر سمجھے اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی پر دونوں کو ایک دوسرے کا قانونی محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مزدور تو آجر کے ساتھ تعظیم کا معاملہ کرنے پر مجبور ہو اور آجر اس کے ساتھ تحقیر و توہین کا معاملہ کرے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے بھی نظام تعلیم اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع سے کام لے کر لوگوں کے ذہنوں کی از سر نو تعمیر کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ ایسے قانونی احکام بھی نافذ کئے جائیں جن کی رو سے ملازمین کے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنا قابل تعزیر جرم ہو۔ اس سے جہاں معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہو گی وہاں سادہ طرز معیشت کے قیام میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

آخر میں ہمیں ایک بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ظلم و استحصال در حقیقت اس بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جو خدا کے خوف، آخرت کی فکر اور انسانی اخلاق سے بے نیاز ہو لہٰذا ہماری معیشت میں جو بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا اصل سبب خود غرضی، سنگدلی، کنجوسی اور مفاد پرستی کی وہ انسانیت سوز صفات ہیں جو ہمیں مغرب کی مادہ پرست ذہنیت سے ورثے میں ملی ہیں اور ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھا چکی ہیں، اگر اسلام کا نظام حیات قائم ہو تو چونکہ اس کی بنیاد ہی خدا کے خوف اور آخرف کی فکر پر ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قانون کے ساتھ ساتھ قلب اور ذہن کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی جائے تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل کو کام میں لا کر ان اسلامی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلایا جائے جو دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کریں، جن کے ذریعہ باہمی اخوت اور ایثار و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں اور جن سے ایسے ذہن تیار ہو سکیں جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح کو دنیا کی ہر مادی منفعت پر فوقیت دیتے ہوں۔

دنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کا ڈنڈا کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کر سکا، اور جب تک قانون کی پشت پر ایک مضبوط روحانی عقیدہ نہ ہو، ظلم و استحصال کو روکا نہیں جا سکتا۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایثار و مروت، انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت واستغناء کے جو

فقید المثال واقعات ملتے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی خدا کا خوف اور آخرت کی فکر تھی جو قوم کے ہر ہر فرد کے رگ و پے میں سما گئی تھی، اگر آج پھر اس جذبے اور عقیدے کو نئی زندگی دی جائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آج بھی لوٹ سکتا ہے۔

قلب و روح اور ذہن و دماغ کا یہ انقلاب بعض لوگوں کو مشکل نظر آتا ہے لیکن اگر حکومت اس انقلاب کو اپنا واقعی نصب العین بنا کر صحیح خطوط پر کام کرے تو ہم دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ چند ہی سال میں ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ جائے گی۔ ہم موجودہ حالات میں خواہ کتنے برے سہی لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ الحمد للہ ہمارے دلوں میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور اگر کوئی اس چنگاری کو ہوا دینے والا مل جائے تو یہ آن کی آن میں بھڑک کر شعلہ بن سکتی ہے۔

اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ میں اسی قوم نے دو مرتبہ بڑا حسین اور قابل فخر کردار پیش کیا ہے، ایک قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے موقع پر اور دوسرے ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے وقت۔ ان دونوں مواقع پر اسی گئی گذری قوم کا ایک حسین رخ نکھر کر سامنے آیا ہے کہ دنیا حیران رہ گئی، جس قوم نے ۴۷ء اور ۶۵ء میں شجاعت و جوانمردی، نظم و ضبط، فرض شناسی ایثار و ہمدردی اور سخاوت و فیاضی کا یہ حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا تھا، کیا یہ وہی قوم نہیں تھی جس کی کام چوری، خود غرضی، بدنظمی اور بخل و مفاد پرستی کا آج رونا رویا جا رہا ہے؟ ــــ جب یہ وہی قوم ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت اس میں اتنا بڑا انقلاب کیوں کر رونما ہو گیا تھا؟

اس سوال پر جتنا بھی غور کیجئے، اس کا صرف ایک جواب ہے کہ درحقیقت ان مواقع پر قوم کے رہنماؤں نے سچے دل سے ایمان کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی تھی اور قوم کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اسے اسلام کے صرف نام پر نہیں بلکہ اس کے حقیقی کام پر دعوت دی جا رہی ہے۔ اس اطمینان نے قوم میں اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام کی عظمت کا جذبہ پیدا کیا اور یہ دکھلا دیا کہ

ایسی چنگاری بھی یا رب میرے خاکستر میں تھی

مگر افسوس کہ اس چنگاری کو ہوا دینے والوں نے آئندہ اس سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور عوام کا یہ ابھار ایک وقتی ابال ثابت ہوا۔ لیکن اگر مستقل طور سے اس چنگاری کو بھڑکایا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قومی شعور دیرپا ثابت نہ ہو، لہٰذا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ

کہی جا سکتی ہے کہ اگر صحیح معنی میں اسلامی نظام قائم ہو اور اس کے لئے قوم سے قربانیاں طلب کی جائیں تو یہی قوم چند سالوں میں ایسی عظیم الشان قوت بن کر ابھرے گی جس کا کوئی مدمقابل نہ ہو گا۔ جو قوم جنگ کے زمانہ میں یرموک و قادسیہ کی یاد تازہ کر سکتی ہو، وہ امن کے زمانے میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کو کیوں زندہ نہیں کر سکتی

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ:۔

(۱) ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی بنایا جائے، (۱) اور طلباء کی تربیت خالص اسلامی خطوط پر کی جائے۔

(۲) ملک کے حکمراں مغربی طرز زندگی کو چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کریں اور قومی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کی واضح اور روشن مثالیں عوام کے سامنے لائیں۔

(۳) نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو خواہ وہ ریڈیو ہو یا اخبارات، اسلامی رنگ میں رنگا جائے، فحاشی، عریانی اور عیش پرستی پر ابھارنے والے پروگراموں کو بالکل بند کر کے ان کی جگہ ایسے پروگرام واضع کئے جائیں، جو قومی شعور، اجتماعی فکر، ایثار، خدا ترسی اور فکر آخرت کے جذبات پیدا کریں۔

(۴) انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے امیدوار کے مطلوبہ دینی اور اخلاقی معیار کو شرط لازم قرار دیا جائے ۔ اور نری کاغذ کی ڈگریوں کو دیکھنے کے بجائے امیدوار کے دینی و اخلاقی کردار پر کڑی نظر کی جائے۔

(۵) "امر بالمعروف اور "نہی عن المنکر" کا مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو دیندار خدا ترس اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اپنی تمام توانائیاں لوگوں میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے پر خرچ کرے۔

(۶) مساجد اسلامی معاشرے کے لئے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو آباد کرنے پر پوری توجہ دی جائے۔ اعلیٰ حکام "اقامت صلوٰۃ" کی تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں۔

اگر اس قسم کے چند اقدامات حکومت کی طرف سے کر لئے گئے تو یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس ملک کی بالکل کایا پلٹ جائے گی، اور یہاں ایک

---

(۱) نظام تعلیم سے متعلق یہ مفصل تجاویز حصہ تعلیم میں ملاحظہ فرمائیے۔

ایسی قوم تیار ہو گی جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی سعی و عمل اور اپنے افکار و جذبات کے لحاظ سے دنیا کے لئے قابل صدر شک ہو گی، افراد سازی کے اس کارنامے کے بعد ظلم و استحصال کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔ اور دنیا خود کھلی آنکھوں دیکھ لے گی کہ جس معاشی بے چینی نے پورے کرۂ زمین کو تہ و بالا کیا ہوا ہے، وہ اسلامی نظام کے تحت خوبصورتی کے ساتھ سکون و اطمینان اور عمومی خوشحالی کے ساتھ بدل گئی ہے۔

مشکلات دنیا کے ہر اہم کام میں ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ کام جو انقلابی نوعیت رکھتا ہو، چنانچہ اسلامی انقلاب لانے میں بھی بلاشبہ مشکلات ہوں گی لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس ملک میں کوئی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں لایا جا سکتا جتنی آسانی سے یہاں اسلامی انقلاب آ سکتا ہے۔ اول تو اس لئے کہ اسلام کی بنیاد پر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ فی نفسہٖ بہت زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ پاکستان کی سرزمین اسلام کے لئے دنیا کے ہر خطے سے زیادہ ساز گار ہے کسی قوم کی زندگی میں انقلاب لانے میں سب سے زیادہ موثر قوت اس قوم کے جذبات اور اس کا انقلابی شعور ہوتا ہے، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی محبت و عظمت اور اسے روبہ عمل دیکھنے کی آرزو یہاں کے عوام کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے، اور اگر انہیں یہ احساس ہو کہ یہاں سچے دل سے اسلامی انقلاب کی کوشش ہو رہی ہے تو وہ ہر کڑی سے کڑی مشکل کو جھیل جائیں گے۔

اس کے برخلاف اگر یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا ہے یا برا، اس کے نافذ کرنے میں اس قدر مشکلات ہوں گی کہ سالہا سال تک ملک کا امن اور چین رخصت ہو جائے گا، سوشلزم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے لائے ہوئے انقلاب میں کشت و خون، جبر و تشدد اور بدامنی و ہنگامہ خیزی جزو لازم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر اس حقیقت سے کوئی شخص ہزار جھوٹ بول کر بھی شاید انکار نہ کر سکے کہ سوشلزم یہاں کے عوام کی آرزو نہیں ہے، اسے لانا نہیں، تھوپنا پڑے گا، اور یہاں کے عوام ہزار طرح کے پروپیگنڈے اور جبر و تشدد کے باوجود اپنے قلبی جذبات کے ساتھ سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ اور صدیوں تک حکومت اور عوام کی رسہ کشی بند ہونے میں نہیں آئے گی۔

اس کے علاوہ سوشلزم کے قیام سے تقسیم دولت کی موجودہ ناہمواری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ زمینوں یا کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لینے سے ایک غریب انسان کی معاشی مشکلات

دور نہیں ہوں گی، کچھ اور بڑھ جائیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کے وکلاء ہمیشہ "قومی ملکیت" کا ایک مبہم نعرہ لگاتے رہے ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی مربوط، منظم اور سوچا سمجھا معاشی پروگرام نہیں ہے۔

علماء کا متفقہ معاشی خاکہ

پچھلے دنوں ملک کے ۱۱۸ مقتدر علمائے کرام کی طرف سے ۲۲ نکات پر مشتمل اسلامی معاشی اصلاحات کا ایک متفقہ خاکہ اخبارات میں شائع ہوا ہے، جس پر تمام مکاتب فکر کے بلند پایہ علماء کے دستخط ہیں۔ یہ متفقہ اعلان بلا شبہ علماء کا ایک عظیم الشان مثبت کارنامہ ہے، اور امید ہے کہ ۵۲ء کے ۲۲ دستوری نکات کی طرح انشاء اللہ یہ ۲۲ معاشی نکات بھی اسلامی جدوجہد کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوں گے۔

ہمارے ملک میں یہ سوال بڑے شد و مد کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کہ جس اسلامی معاشی نظام کو سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں انسانیت کی صلاح و فلاح کا ضامن بتایا جا رہا ہے، وہ ہے کیا؟ اور کس طرح نافذ ہو سکے گا؟ علماء کے اس متفقہ خاکہ نے اس سوال کے جواب میں اسلامی معیشت کے بنیادی خدو خال خوب اچھی طرح واضح کر دیئے ہیں، اور جو شخص بھی انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ ان نکات کا بغور مطالعہ کرے گا، وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ مسلمانوں کو سرمایہ داری کے ظلم و استحصال کا علاج تلاش کرنے کے لئے ماسکو اور پیکنگ کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی معاشی اصلاحات کی توضیح کے علاوہ اس اعلان کا نہایت روشن پہلو یہ ہے کہ یہ معاشی خاکہ تمام مسلمانوں کے مکاتب فکر کے اتحاد و اتفاق سے منظر عام پر آیا ہے۔ اور اس میں دیوبندی، بریلوی اہل حدیث اور شیعہ حضرات کے دستخط پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت علما کے اختلافات کا شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کر کے ذہنوں پر یہ تاثر بٹھانے کی منظم کوشش کی گئی ہے کہ علماء کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی نقطۂ اتفاق موجود نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں صحیح اسلامی نظام کے قیام سے عام مایوسی پیدا کی جائے، اور جب اس ملک کی گاڑی کو اسلامی خطوط پر چلانے کا سوال آئے تو یہ

کہہ کر بات ختم کر دی جائے کہ علماء کے اختلافات کی موجودگی میں پورے ملک کے لئے کوئی متفقہ نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ زیادہ تر عبادات اور فروعی عقائد سے متعلق ہیں، اور ملک و ملت کے اجتماعی مسائل میں ان کے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو کسی بھی مرحلے پر اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں رکاوٹ بن سکے۔ جہاں تک ملک کے دستور کا تعلق ہے، اس میں مختلف فرقوں کے درمیان کوئی ایک اختلاف بھی نہیں ہے، ۱۹۵۱ء میں ہر مکتب فکر کے مقتدر علماء کا کنونشن منعقد ہوا، اور اس نے ۲۲ دستوری نکات متفقہ طور پر طے کئے، ان ۲۲ نکات میں کسی ایک عالم کا آج تک کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا، اور اب بھی ہر دینی جماعت اور مکتب فکر کے دینی رہنما ملک کے ہر گوشے سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کا آئین ان بائیس نکات کی بنیاد پر بنایا جائے۔ اسی طرح ملکی قانون کے معاملے میں بھی ان فرقوں کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں، صرف شخصی قوانین کی حد تک ایک دو فرقوں کا اختلاف ہو گا، لیکن اس کا حل خود انہی ۲۲ نکات میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ ان فرقوں کے شخصی قوانین الگ بنا دیئے جائیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ہر شخص خود سوچ سکتا ہے کہ علماء کے اختلافات کا جو راگ صبح و شام الاپا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور کس طرح ایک رائی کے دانے کو پہاڑ بنا کر پیش کیا گیا ہے؟ لیکن جب ہمارے ملک میں اسلام اور سوشلزم کی بحث چلی اور سوشلزم کے حامی حضرات سے یہ کہا گیا کہ پاکستان تو اسلام کے لئے بنا تھا تو جواب میں ہمارے بہانوں کے علاوہ ایک اس بہانے کا بھی شدت کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا رہا کہ علماء کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کی موجودگی میں کوئی متفقہ نظم معیشت قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

علماء کے اس متفقہ معاشی خاکے نے اس پروپیگنڈے کی قلعی بھی خوب اچھی طرح کھول دی ہے، اور اب یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اسلام کے جس معاشی نظام کو علماء فلاح و بہبود کا ضامن بتاتے ہیں۔ وہ ہے کیا؟ اور تمام فرقوں کے اتفاق سے کیوں کر نافذ ہو سکتا ہے؟

توقع کے مطابق علماء کی اس قابل قدر خدمت کو ملک کے ہر طبقے کی طرف سے خوب سراہا گیا ہے، علماء سیاسی رہنماؤں اور صحافیوں کے علاوہ ملک کے ممتاز ماہرین معاشیات نے بھی اس کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے، اور ماہرین معاشیات نے یہ یقین بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر اسی معاشی خاکہ کو عملاً نافذ کیا جائے تو ملک میں عام خوشحالی کی فضا پیدا ہو جائے

گی۔ آج کی صحبت میں ہم ان ۲۲ معاشی نکات کی چند نمایاں خصوصیات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان مختصر نکات کے اثرات و نتائج نسبتہً وضاحت کے ساتھ سامنے آسکیں۔

ایک مسلمان معاشرے کے لئے معاشی نظام کی جو بنیادیں طے کی جائیں، ان پر دو حیثیتوں سے غور ہونا چاہئے، ایک اس حیثیت سے کہ یہ بنیادیں اسلام کے کس حد تک مطابق ہیں۔ اور دوسرے اس حیثیت سے کہ وہ موجودہ دور میں کس حد تک قابل عمل ہیں؟ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے، اس معاشی خاکے کی صحت کے لئے یہ ضمانت بالکل کافی ہے کہ اس پر تمام مکاتب فکر کے ایسے مقتدر اور مستند علماء کے دستخط ہیں جن پر پوری امت دینی رہنمائی کے سلسلے میں پورا اعتماد کرتی ہے۔ ان تجاویز کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسلامی احکام کو بالکل صحیح شکل و صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور وقت کے کسی چلتے ہوئے نظام یا نعرے سے مرعوب ہو کر اسلام میں کسی قسم کی کتربیونت کی کوشش نہیں کی گئی۔

اسلام چونکہ قیامت تک کے ہر زمانے کے لئے مکمل نظام زندگی لے کر آیا ہے اس لئے اسے کسی زمانے کی ضرورت کے مطابق بدلنے، بگاڑنے، یا اس میں تحریف و ترمیم کی ضرورت نہیں، اس میں بذات خود اتنی لچک موجود ہے کہ وہ ہر زمانے کی واقعی ضروریات کا ساتھ دے سکے، اس نے قطعی نصوص کے ذریعے جو احکام دیئے ہیں، اور جن پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو گیا ہے، وہ صرف ایسے مسائل سے متعلق ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا ہر دور میں قابل عمل اور سدا بہار رہتے ہیں، ہاں جن مسائل پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی ہے، ان میں اسلام نے قطعی اور متعین احکام دینے کے بجائے کچھ اصول بتا دیئے ہیں۔ جن کی روشنی میں ہر زمانے کے لئے الگ راہ عمل متعین کی جا سکتی ہے، اسلام میں مباحات کا ایک وسیع دائرہ اسی مقصد کے لئے ہے کہ اسلامی معاشرہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق اپنے طریق کار میں حسب ضرورت تبدیلیاں کر سکے۔ اس کے علاوہ بعض احکام میں ہنگامی حالات کے لئے الگ ہدایات دی گئی ہیں، جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ کام بے انتہا نازک ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں تحقیق اور تحریف کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں، اس لئے یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے قرآن و سنت کو سمجھنے میں اپنی عمریں کھپائی ہوں، اسلامی شریعت کے مآخذ کو کھنگالا ہو، اور دین کے صحیح

مزاج و مذاق کو سمجھنے کی حقیقی کوشش کی ہو، خدا کا شکر ہے کہ اس معاشی خاکہ کے مرتب کرنے والوں میں بھاری تعداد ایسے ہی حضرات کی ہے اور انہوں نے اس کام کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔ چنانچہ اس میں بعض احکام کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔ چنانچہ اس میں بعض احکام عبوری نوعیت کے بھی ہیں، مثلاً حکومت کی طرف سے قیمتوں کا تعین، اسلام کا اصل منشاء یہ ہے کہ بازار سے اجارہ داریاں بالکل ختم ہوں، اور ان کی جگہ آزاد مسابقت کی فضا پیدا ہو جس میں تمام اشیاء و خدمات (''GOODSAND SERVICES'') فطری عوامل کے تحت اپنی قیمت آپ متعین کریں، اور معاشیات میں بصیرت رکھنے والے تمام ماہرین اس پر متفق ہیں کہ بازار میں عام ارزانی پیدا کرنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں، ریٹ کنٹرول کے مصنوعی طریقوں سے قیمتیں مقرر کرنا بھی مستقل طور پر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ معیشت کے جسم میں اندرونی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ بازار سے اجارہ داریوں کا خاتمہ ایسا کام نہیں ہے جو آناً فاناً انجام پا جائے، اس لئے ریٹ کنٹرول کے طریقے کی اجازت اسلام نے صرف عبوری دور کے لئے دی ہے۔ چنانچہ علماء نے بھی اپنے معاشی خاکہ میں یہ تجویز عبوری دور کے لئے ہی پیش کی ہے۔

اسی طرح کسی کی جائز ملکیت کو زبردستی چھین لینا تو اسلام کی قطعی نصوص کے بالکل خلاف ہے اور اسے کوئی اجتہاد حلال نہیں کر سکتا، اس لئے علماء کے اس خاکہ میں اس قسم کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سالہا سال کے غلط نظام معیشت کی بناء پر ہمارے ملک میں ارتکاز دولت کا عظیم فتنہ پیدا ہو گیا ہے اس لئے علماء نے کئی متبادل تجاویز پیش کی ہیں جو اسلام کے مطابق بھی ہیں اور سرمایہ وارانہ ارتکاز کو ختم کر کے تقسیم دولت کو متوازن بنانے کے لئے بے حد مفید بھی۔ مثلاً۔۔۔

(۱) خاکہ کے نکتہ نمبر ۶ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ نیم سرکاری صنعتوں میں صرف ان لوگوں کو حصہ دار بنایا جائے جن کی آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے کم ہے، اور اب تک ایسی صنعتوں میں زائد آمدنی والے جن افراد کے حصص ہیں، ان کے ساتھ سال ختم ہونے پر شرعی قواعد کے تحت معاہدہ فسخ کر دیا جائے!

کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے مقابلے میں یہ تجویز غریب اور

متوسط طبقے کے عوام کے لئے کہیں زیادہ مفید ہو گی، کیونکہ صنعتوں کی قومی ملکیت سے عوام براہ راست صنعتوں کے مالک نہیں بنتے، اس کے بجائے مذکورہ صورت میں وہ براہ راست صنعتوں کے مالک ہو کر ان کے منافع میں شریک ہوں گے۔

(۲) نکتہ نمبر ۹ا میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوۃ ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کی جائے۔

(۳) نکتہ نمبر ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے صنعتکاروں پر یہ شرط بھی عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر، یا خاص مدت میں، یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضہ میں کسی خاص کارخانے میں مالکانہ حصص دیا کریں۔

(۴) زمینوں کے ارتکاز کو دور کرنے کے لئے نکتہ نمبر ۱۴ میں اسلام کے نظام وارثت کو نافذ کرنے کی سفارش کی گئی ہے، بڑی بڑی جاگیروں میں اگر اسلامی قواعد کے مطابق وراثت جاری کی جائے تو چند ہی سال میں ساری بڑی بڑی زمینیں مناسب اکائیوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

(۵) نکتہ نمبر ۱۱ میں کہا گیا ہے کہ بٹائی کے معاملہ میں جس ظالمانہ رسم و رواج نے جڑ پکڑ لی ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں، اگر اس پر فوری طور پر قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ بھی نیار ہے کہ وہ ایک خاص مدت کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں. یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشت کار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے، اس اجرت کا تعین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک اپنی زمینوں کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدورں کاشت کاروں کو دیں گے۔

(۶) نکتہ نمبر ۱۳ سفارش کی گئی ہے کہ اس وقت تک جتنی زمینیں رہن رکھی

ہوئی ہیں، وہ چونکہ سود کے معاملہ پر گروی دی گئی تھیں، اس لئے ان سب کو چھڑا کر قرضدار کو واپس دیا جائے اور قرض خواہوں نے ان سے جتنی آمدنی حاصل کی ہے وہ قرض میں محسوب کی جائے۔

بلاشبہ یہ تجاویز ایسی ہیں کہ اگر ان پر خاطر خواہ طریقے سے عمل کر لیا جائے تو ہمارا معاشرہ دولت کی جس شدید ناہمواری میں مبتلا ہے، وہ ختم ہو جائے گی اور اس طرح آئندہ اسلامی نظام معیشت کے حقیقی فوائد و ثمرات حاصل کرنے کے لئے زمین ہموار ہو سکے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ارتکاز دولت کے جو مفاسد پیدا کئے ہیں، یہ تو ان کے فوری علاج کی تدابیر تھیں، آئندہ اپنی معیشت کے ڈھانچے کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے جو سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ وہ بلاشبہ بڑی انقلابی ہیں اور چونکہ معیشت کی پائیدار فلاح و بہبود انہی پر موقوف ہے، اس لئے یہ تجاویز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

ان تجاویز میں سب سے پہلی تجویز سود کا خاتمہ ہے، اس بات کو تسلیم نہ کرنے کی اب ہٹ دھرمی کے سوا کوئی وجہ نہیں رہی کہ سود نے ہمارے نظام تقسیم دولت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی وہ سب سے بڑی لعنت ہے جس نے ہمیشہ ملک کے سارے عوام کو قلاش بنا کر چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پالا ہے۔ موجودہ بنکاری کے نظام میں سود کی حیثیت بلاشبہ ایک سرنج کی ہے، جس سے عوام کا خون نچوڑنے کا کام لیا جا رہا ہے، اس لئے علماء نے تجویز پیش کی ہے کہ بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو سود اور قمار کی لعنت سے پاک کر کے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تاکہ عوام کی جمع شدہ رقموں کا منافع صرف چند سرمایہ دار نہ اٹھائیں، بلکہ وہ پوری قوم میں متناسب طریقے سے تقسیم ہو۔

بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو شرکت و مضاربت کے اصول پر چلانے کا طریق کار کیا ہوگا؟ اس کی تفصیل مختلف دینی اور علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہے، ہمارے ملک کے اونچے درجہ کے ماہرین معاشیات اور بنکاری کا وسیع تجربہ رکھنے والے حضرات بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ یہ طریق کار نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ اس سے عام قومی خوشحالی پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام انقلابی نوعیت کا ہے، اسے خاطر خواہ طریقے سے انجام دینے میں کچھ وقت بھی لگے گا اور محنت بھی صرف ہوگی، لیکن خود اپنے پیدا

کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کے لئے یہ محنت بہر صورت ناگزیر ہے۔ اور اس کے بغیر اپنی معیشت کی کشتی کو، جو تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے، ساحل مراد کی طرف نہیں موڑا جا سکتا۔

ہمارے ملک کے وہ مغرب زدہ حضرات جو اپنی بصیرت کو مغرب کی غلامی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں، عام طور سے عوام کے ذہنوں میں یہ الجھن پیدا کیا کرتے ہیں کہ اگر سود ختم کر دیا گیا تو غیر ممالک کے ساتھ معاملات کی شکل کیا ہوگی؟ ____ یہ درست ہے کہ ہم ابھی اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ دنیا بھر سے سود کی لعنت کو ختم کر دیں لیکن اگر ہم ایک بیماری کو ساری دنیا سے ختم نہیں کر سکتے تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن سکتی ہے کہ ہم اپنے ملک میں بھی اس بیماری کا علاج نہ کریں؟ اگر ہمیں بیرونی معاملات میں سود کو ختم کرنے پر فی الحال قدرت محسوس نہیں ہوتی تو اپنے اندرونی معاملات میں تو ہم اس پر پوری طرح قادر ہیں، ایک عالمگیر برائی کو ایک دم سے راتوں رات ختم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لئے کئی مدارج سے گزرنا پڑتا ہے، اور یہ طرز فکر عجیب و غریب ہے کہ اگر ایک چھلانگ میں چھت تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو چھت تک جانے والی پہلی سیڑھی پر بھی مت چڑھو۔

ایک اسلامی حکومت کا طریق کار یہ ہونا چاہئے کہ پہلے وہ اپنے ملک کے اندرونی معاملات کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے سود کو ختم کرے، پورے عالم اسلام کے لئے ایک بہترین نمونہ قائم کر کے تمام اسلامی ممالک کو اس کی تقلید کی دعوت دے، اور اپنے بیشتر تجارتی تعلقات اسلامی ممالک سے قائم کرنے کی کوشش کرے جن کا غیر سودی بنیادوں پر قائم ہونا نسبتہً آسان ہوگا۔ پھر جہاں غیر مسلم ممالک کے ساتھ تجارتی معاملات ناگزیر ہوں وہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ یہ معاملات تبادلہ اشیاء (BARTER) کی بنیاد پر ہوں (اشتراکی ممالک سرمایہ دار ممالک سے اسی طرح کے معاملات بکثرت کرتے رہے ہیں) اور اگر کہیں سود کے سلسلے میں غیر مسلموں کی شرط تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہو تو بہرحال سخت مجبوری کے حالات میں اسلام نے ہر طرح کی گنجائشیں دی ہیں، جب تک مجبوری باقی ہو، ان گنجائشوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ساتھ ہی ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر مسلمان ممالک پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنی معیشت کو سود سے نجات دلانے کا تہیہ کر لیں تو وہ تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیا سے اپنی شرائط منوانے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں، ان کا نظام معیشت دوسروں کے لئے مشعل راہ بھی بن سکتا ہے اور کم از کم انہیں اس بات پر ضرور مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے

ساتھ تجارتی معاملات میں سود کا عمل دخل بالکل ختم کر دیں لیکن یہ سب باتیں عزم اور جذبۂ عمل پر موقوف ہیں محض کسی کام کی مشکلات کا ہوّا ذہن پر مسلط کر کے بیٹھ جانا زندہ قوموں کا کام نہیں ہوتا، کامیابی انہیں لوگوں کا مقدر ہوتی ہے جو صحیح راستہ پر سخت سے سخت حالات میں قدم بڑھانے کا حوصلہ رکھتے ہوں

علماء نے اسلامی نظام معیشت کے قیام کے لئے دوسری انقلابی تجویز یہ پیش کی ہے کہ سٹہ کا کاروبار بالکل ممنوع کر دیا جائے، اس وقت بازار کی ہوشربا گرانی کا ایک بہت بڑا سبب جس نے ہماری معیشت کو تہ وبالا کیا ہوا ہے، یہی سٹہ کی اندھی تجارت ہے، ہمارے موجودہ نظام معیشت میں چند بڑے بڑے سٹہ باز اپنی حرص و ہوس کا پیٹ بھرنے کے لئے کروڑوں عوام کی قسمت سے کھیل رہے ہیں، اس ظالمانہ کھیل کی وجہ سے ابھی مال بازار میں پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ اس پر بیسیوں سودے ہو جاتے ہیں، اور جب مال عوام کی دسترس میں آتا ہے تو اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اسے آگے بیچنے کو ممنوع قرار دیا ہے، اگر اس قانون پر سختی کے ساتھ عمل ہو تو وہ سارا درمیانی نفع جو سٹہ باز لے اڑتے ہیں، اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے۔ اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں بھی سٹہ ہی وہ چیز ہے جس سے پورے ملک کی معیشت بار بار بحران کا شکار ہوتی ہے، اور بعض اوقات کسی ایک سٹہ باز کا پیدا کیا ہوا رجحان پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اور یہی نہیں، سٹہ بازی کی لعنت تجارت میں مکر وفریب کو باقاعدہ فن بنا کر تاجروں کو سینکڑوں اخلاقی جرائم میں مبتلا کرتی ہے، اور اس طرح اسٹاک ایکس چینج کے احاطے میں بڑے بڑے اسکینڈل پرورش پاتے ہیں، لہٰذا اگر علماء کی تجویز کے مطابق سٹہ کو ممنوع کر دیا جائے تو معیشت کی بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو سکتی ہیں۔

تیسری انقلابی تجویز یہ ہے کہ غیر ملکی تجارت کو لائسنس پرمٹ کے مروجہ طریقہ سے آزاد کر دیا جائے، اس وقت تجارتی اجارہ داریوں کا بہت بڑا سبب یہ تجارتی پابندیاں ہیں، ملک کا زرمبادلہ پوری قوم کا مساوی حق ہے، لیکن موجودہ نظام میں عوام کو کاغذ کے نوٹوں کے سوا کچھ نہیں ملتا، نتیجہ یہ کہ سارے، زرمبادلہ سے وہ بڑے بڑے سرمایہ دار فائدہ اٹھاتے ہیں جو اپنے جائز یا ناجائز وسائل سے غیر ملکی تجارت کا لائسنس حاصل کر لیں، اوپر سے عوام پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ اپنے نجی وسائل کام میں لا کر حکومت سے زرمبادلہ لئے بغیر بھی باہر سے مال نہیں منگوا سکتے، چنانچہ وہ پابند ہیں کہ صرف ان بڑے سرمایہ داروں کا مال خریدیں جو عوام کی

اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر گھٹیا چیز مہنگے داموں فروخت کرنے کے عادی ہیں۔ یہ سرمایہ دار پورے بازار کے تنہا اجارہ دار بن کر پوری معیشت پر حکمرانی کرتے ہیں اور عوام کا روپیہ سمٹ سمٹ کر ان کی جھولی میں جاتا رہتا ہے۔

اگر علماء کی تجویز کے مطابق تجارت کو آزاد کر دیا جائے تو یہ صورت حال ختم ہو جائے گی، بازار سے اجارہ داریاں ٹوٹیں گی، چھوٹے تاجر میدان میں آئیں گے، ان میں آزاد مقابلہ ہوگا، اور عوام کو اشیائے صرف سستے داموں ہاتھ آسکیں گی۔ عوام کی جیبوں سے روپیہ آج کی نسبت کم نکلے گا اور زیادہ وسیع دائروں میں پھیلے گا، اور دولت کے اس فطری بہاؤ کا خوشگوار اثر پوری معیشت پر پڑنا لازمی ہے۔

چوتھی انقلابی تجویز یہ ہے کہ کارٹیل کے طرز کی اجارہ داریوں کو ممنوع کر دیا جائے جس کے ذریعہ بڑے صنعت کار باہم سمجھوتہ کر کے، اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں، اور عوام آزاد مقابلہ کی برکات سے مستفید نہیں ہو پاتے، اسلام میں اس طرح کا اشتراک جو عام گرانی کا سبب بنتا ہو، قطعی طور پر ناجائز ہے اس حکم کو نافذ کرنے سے ان اجارہ داریوں کے قیام کا راستہ بھی بند ہو جائے گا۔ جو باہمی معاہدہ اور سمجھوتہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

پانچویں انقلابی تجویز علماء نے زرعی پیداوار کی فروخت کے سلسلے میں پیش کی ہے، اور وہ یہ کہ آڑھتیوں اور دلالوں کے درمیان وسائط ختم کر دیئے جائیں، اور کسانوں کی امداد باہمی کی انجمنیں فروخت کا کام انجام دیں، اس تجویز پر عمل کرنے سے ایک طرف کسانوں کو اپنی محنت کا مناسب صلہ مل سکے گا، اور دوسری طرف آڑھتیوں کے بیچ میں سے ہٹ جانے سے بازار میں ارزانی آئے گی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ امداد باہمی کی انجمنیں چھوٹے علاقوں کی بنیاد پر قائم ہوں تاکہ منڈی میں مقابلے کی فضا باقی رہے، اور گرانی پیدا نہ ہوسکے۔

زراعت کے سلسلے میں بھی جو ظلم وستم کسانوں پر ہوتا ہے اس کے انسداد کے لئے علماء نے بٹائی کے معاملے کو سدھارنے کی موثر تدبیریں بتائی ہیں، اور ایسی سفارشات بھی پیش کی ہیں جن کے ذریعہ کسان اپنی محنت کا پورا پھل پانے کے علاوہ زمینوں کے مالک بھی بن سکیں گے۔

یہاں علماء کی تمام تجاویز کو باستیعاب پیش کرنا مقصود نہیں، صرف چند نمایاں تجاویز کے نتائج واثرات کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے اتنی بات واضح ہو سکتی ہے کہ علماء نے یہ تجاویز پوری معاملہ فہمی کے ساتھ حقیقت پسندی کے ماحول میں مرتب کی ہیں، پورے خاکہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں سیاسی نعرہ بازی کا انداز اختیار کرنے کے بجائے

معاملات کا علمی سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، مثلاً آج اجرتوں میں اضافہ کے نعروں کا بہت زور ہے لیکن علماء نے اس کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے ملک سے عام گرانی کو ختم کرنے پر زور دیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مزدور کی تنخواہ دوگنی کر دی جائے لیکن اشیاء صرف کی گرانی میں تین گناہ اضافہ ہو جائے تو اس سے گھاٹا پھر بیچارے مزدور ہی کا ہے، عوام کا اصل مسئلہ آمدنی کی کمی سے زیادہ اخراجات کی زیادتی کا ہے، اور معیشت کی اصلاح کا کوئی اقدام اس وقت تک عوام کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ عام گرانی کو ختم نہ کیا جائے خوشی کی بات ہے کہ علما نے اس بنیادی نکتے کا ہر قدم پر لحاظ رکھا ہے۔

اسی طرح ہماری معاشی مشکلات بڑی حد تک خود ہماری پیدا کی ہوئی بھی ہیں ہم نے طرز زندگی کو اتنا پر تکلف اور مصنوعی بنالیا ہے کہ ہماری معیشت کی چادر اس کے لئے کافی نہیں ہو رہی، علماء نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ جب تک سادہ طرز معیشت کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں اپنایا جائے گا، اور ملک کے حکام اور دولتمند افراد اس تحریک کی ابتداء اپنے آپ سے نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم عام خوش حالی کی حقیقی برکتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ فقر وفاقے کا شب و روز رونا رونے کے ساتھ ساتھ ہم نے جن عیاشیوں کو جزو زندگی بنا لیا ہے وہ ہر حیثیت سے گھر پھونک تماشا دیکھنے کے مترادف ہیں، اور انہیں سختی سے چھوڑے بغیر ہم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔

علماء کی یہ تجاویز اپنے عملی نفاذ کے لئے بیشک کچھ وقت اور محنت چاہتی ہیں، لیکن قوم کی بگڑی ہوئی حالت کو راتوں رات نہیں سنوارا جا سکتا کھل جا سم سم کا ایسا نسخہ کسی بھی نظام معیشت کے پاس نہیں ہے جو وقت اور محنت کے بغیر کوئی معاشی انقلاب لے آئے، ہاں یہ بات پورے یقین، اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی معاشی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں آسکتا جتنی آسانی سے اسلامی انقلاب آسکتا ہے اس کی بڑی وجہ جہاں اسلامی شریعت کی دی ہوئی آسانیاں ہیں، وہاں ہماری قوم کا وہ ٹھیٹھ دینی مزاج اور اسلامی جوش وخروش بھی ہے جو اسے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار کر دیتا ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ اسے یہ بھروسہ ہو کہ اسلام کا صرف نام استعمال کرنا پیش نظر نہیں بلکہ اسے سچے دل سے نافذ کرنا مقصود ہے۔

ہماری قوم اپنی ہزار خامیوں کے باوجود بحمد اللہ اب بھی مسلمان رہ کر ہی جینا اور مرنا چاہتی ہے، اور اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کو آج بھی تیار ہے، ۱۹۴۷ء اور ۶۵ء میں

دنیا اس کا یہ حسین کردار کھلی آنکھوں دیکھ چکی ہے، اور اگر کبھی اس ملک کی کشتی نے حقیقی اسلام کی طرف رخ موڑا تو دنیا پھر دیکھ لے گی کہ اس کے رگ و پے میں اسلام کو جذب کرنے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔

اس کے برخلاف اگر خدانخواستہ یہاں سوشلزم لایا گیا تو قطع نظر اس سے کہ وہ مفید ہے یا مضر، اسے عملاً نافذ کرنے میں ناقابل عبور مشکلات ہوں گی، اس ملک کے عوام کا اسلامی شعور قدم قدم پر آڑے آئے گا، اور یہ قوم کبھی بھی سچے دل کے ساتھ اس نظام کو جذب و قبول نہیں کر سکے گی۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ علماء کے اس متفقہ معاشی خاکے کی روشنی میں اسلامی اصلاحات کی طرف عملی قدم اٹھایا جائے، ہماری رائے میں تمام اسلامی نظام چاہنے والی جماعتوں کو چاہئے کہ وہ ان ۲۲ نکات کو اپنے منشور میں شامل کریں، اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں۔

ہمارے معاشی مسائل

اور ان کے اسلامی حل کی مختلف تجاویز (۱)

سوشلزم کے مقابلے میں علماء کرام جو اقتصادی پروگرام پیش کر رہے ہیں وہ اجتہاد کے درجہ میں ہے، علماء اجتہاد کے اہل ہیں، اس حقیقت کو علماء سے بہتر کون کون جان سکتا ہے کہ اگر اختلاف پر قدغن لگائی جائے تو اجتہاد کا صواب و خطا کبھی معلوم نہیں ہو سکتا اور یہی امت کے لئے رحمت سے محرومی ہے۔ یہ کتنی بڑی محرومی ہے۔ اس کا اندازہ اس قوم کو بخوبی ہونا چاہئے جو ابھی دہ سالہ دور ایوبی سے نکلی ہے۔ ایک عرض یہ ہے کہ عوام تو فقہی دلائل کے مخاطب نہیں ہوتے لیکن اگر دینی رسائل میں اس اقتصادی پروگرام کے ساتھ اصولی فقہی دلائل بھی شرح وبسط سے بیان کر دیئے جائیں تو طالب علموں کے لئے باعث طمانیت ہو گا۔ چند امور کی بابت استفسار (لیطمئن قلبی) بے جا نہ ہو گا۔

ا۔ جن مغربی مفکرین نے مغرب کے نظام حیات کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مشہور مورخ (TOYNBEE) کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک بات (میرے خیال میں بڑے پتہ کی) لکھی ہے جو ہمارے لئے بھی قابل توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دنیا کے گوناگوں مصائب کی علت العلل یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے قومیت و وطنیت متصادم ہے۔ سائنس انسان کے افق کو وسعت دیتی ہے، وطنیت اسے تنگ بناتی ہے، سائنس تعمیم خیر

(۱) یہ اصل میں جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب کا ایک مضمون ہے جس میں موصوف نے ہمارے نظام معیشت کے چند بنیادی مسائل سے بحث فرمائی ہے، اور علماء کی طرف سے جو اقتصادی پروگرام پیش کئے جاتے رہے ہیں، ان پر اظہار رائے کیا ہے، فاضل مضمون نگار کی خواہش کے مطابق آخر میں ہم نے اس سلسلہ میں اپنی رائے بھی قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کر دی ہے، اور اس طرح ان دونوں مضمونوں نے ایک قلمی مذاکرہ کی صورت اختیار کر لی ہے، امید ہے کہ یہ مذاکرہ اہل علم وفکر کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا۔ م۔ ت۔ ع

کی طرف آگے بڑھتی ہے، وطنیت سائنس کی خیرات کا استثمار اور استغلال کرتی ہے۔ یورپ میں جس وقت صنعتی انقلاب آیا اسی وقت وطنیت و قومیت کا جذبہ اٹھا۔ یہ سوء اتفاق تمام عالم کے لئے استعمار و استعباد کی وبا لایا۔ آج مشرق کی پسماندہ اقوام (جنہیں مجاملۃً ترقی پذیر کہا جاتا ہے) مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی، نقل مطابق اصل وطنیت و قومیت کے ساتھ لے رہی ہیں۔ اس لئے وطنیت کے نام پر عوام زیر بار ہوتے ہیں اور جتنی صنعت ترقی کرتی ہے دولت چند خاندانوں میں سمٹتی آتی ہے۔ جب یہ صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی ہے تو اس کا علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کی "تامیم" کی جائے یعنی انہیں قومی ملکیت میں لے لیا جائے ـــ ایک مثال لیجئے۔ ٹکنالوجی کے فروغ کا طبعی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مجھے اچھے سے اچھا لٹھا کم سے کم قیمت میں دستیاب ہو۔ اگر طبعی حالات رہیں تو جیسے جیسے ٹکنالوجی ترقی کرے گی وطنیت کی جودت بڑھتے جائے گی اور قیمت گھٹتی جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو مشین کبھی چرخے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ وطنیت اور قومیت ان طبعی حالات کو درہم برہم کرتی ہے تو یہ ہوتا ہے کہ وطن میں بنا ہوا گھٹیا لٹھا مہنگے داموں مجھے فراہم ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایسا سودا انسانی فطرت کے خلاف ہے مجھ پر جبر کیا جاتا ہے، اور وہ یوں کہ اچھے اور سستے لٹھے کی درآمد ہی بند کر دی جاتی ہے۔ الغرض ٹیکنالوجی مجھے اچھا لٹھا ۵۰ پیسے فی گز مہیا کرتی تو وطنیت بالجبر گھٹیا لٹھا ڈھائی تین روپے گز میرے گلے لگاتی ہے۔

ملکی صنعتیں کیسے قائم ہوتی ہیں؟ مختصراً یہ کہ ملکی پیداوار کی برآمد میں ہمارا پیٹ کاٹ کر اضافہ کیا جاتا ہے (باسمتی چاول، اچھے قسم کی چائے کو ہم ترستے ہیں)۔ جوٹ، کپاس، چاول، چائے وغیرہ سے جو زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے اس پر حکومت قابض ہو جاتی ہے (اور ہمیں کاغذ کے نوٹ حوالہ کرتی ہے) اس میں اس زر مبادلہ کا اضافہ کیا جاتا ہے جو ترقی یافتہ ممالک سے سودی قرضوں کی شکل میں لیا جاتا ہے۔ (کوئی قرضہ سیاسی اغراض سے پاک نہیں ہوتا۔ جب ذرا سر اٹھایا قرضہ بند)

پھر حکومت اس زر مبادلہ کو کسی سرمایہ دار صنعت کار کے حوالے کر دیتی ہے سرمایہ دار صنعت قائم کرتا ہے اور صنعت کو (PROTECTION) حکومت کی رعایت و حمایت حاصل ہو جاتی ہے، یعنی یہ کہ ملک میں صرف ملکی مصنوعات فروخت ہوں گی۔ خواہ وہ کیسی ہی ردی اور مہنگی ہوں۔ اب اس کا بار عام مستہلکین (Consumers) پر پڑتا ہے، عام خریدار کی جیب سے جو بھاری قیمت نکلتی ہے اس کا ایک حصہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کو جاتا

ہے، باقی سے سرمایہ دار موٹا ہوتا جاتا ہے، عام لوگ اقتصادیات کے ماہر نہ ہوں، ان کا اندازہ روزمرہ کے ٹھوس تجربہ پر مبنی ہوتا ہے، اور بالکل صحیح ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جو چیز ملک میں بننی شروع ہوتی ہے وہ گراں ہو جاتی ہے۔ اس کی رسد غیر یقینی ہوتی ہے اور دھوکہ اور ملاوٹ کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ معاملہ یہیں تک رہے تو بھی غنیمت ہے۔ آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار کو جب ایوب کی لیگ میں چندہ دینا ہوتا ہے وہ کپڑے کی مصنوعی قلت پیدا کر دیتا ہے، پھر قیمت بڑھا دیتا ہے۔ مہنگائی مزدور کی کمر توڑتی ہے، سرمایہ دار مزدور کا استحصال کئے جاتا ہے، حکومت (Indirect Taxes) میں اضافہ کرتی ہے اور سرمایہ دار کو خون چوسنے کی اجازت (شہ) دیتی ہے۔ آئے دن اشیاء کی قلت، قیمتوں کا آسمان سے باتیں کرنا، عوام کی غربت میں اضافہ، مزدور کی ناقابل برداشت بدحالی، اور سرمایہ دار کے سرمایہ میں اضافہ، یہ سب نتیجہ اس (Protection) کا ہے جو وطنیت کے نام پر دیا جاتا ہے، جب سرمایہ دار کی نوچ کھسوٹ منظر عام پر آجاتی ہے، جیساکہ آج پاکستان میں ہے ا۔ تو حکماء مغرب کا ہی تجویز کردہ علاج "تامیم" ہے۔ تامیم سے غرض یہ ہوتی ہے کہ عام خریدار کی جیب سے جو رقم نکلتی ہے وہ سرمایہ دار کی تجوری میں جانے کے بجائے حکومت کے خزانے میں جائے اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ ہو، تاکہ اس کا فائدہ لوٹ کر عوام کو پہنچے۔

تنقیح طلب باتیں یہ ہیں:۔

(الف) خالص شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا جواز ہے کہ حکومت درآمد بند کر کے عام مستہلکین کو مجبور کرے کہ وہ کسی ایک یا معدودے چند سرمایہ داروں کی مصنوعات ان کی من مانی غیر معقول قیمت پر خریدیں اور مسلسل عمداً اشیاء کی قلت اور قیمتوں میں اضافہ برداشت کریں؟ کیا ایک ہی ملک میں یہ جائز ہو گا کہ مثلاً سندھ کے چند زمیندار پنجاب سے غلہ کی درآمد پر پابندی لگوا دیں اور سندھ کے لوگوں کو اپنی من مانی قیمت پر غلہ فروخت کریں؟ کیا رسالت یا خلافت راشدہ کے عہد میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے جس پر اس مسئلہ کو قیاس کیا جائے؟ (Protection) کا تصور کہاں تک اسلامی اصولوں سے میل کھاتا

---

(۱) پاکستان ہی پر موقوف نہیں۔ ہندوستان بھی آج اسی مرحلہ میں ہے۔ مسز اندرا گاندھی جس کشمکش میں مبتلا ہیں وہ اسی کا رمز ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام ترقی پذیر ممالک کا یہی حال ہے۔ سرمایہ دارانہ تصنیع (Industriali Sation) کی راہ کے ممالک کو اس مقام سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

ہے؟ ۲ ؎

(ب) تامیم کے خلاف جتنی دلیلیں اس وقت تک نظر سے گزری ہیں وہ سب عقلی ہیں، نوکر شاہی مسلط ہو جائے گی، کارکردگی کا معیار گر جائے گا، مزدوروں کے حق میں کچھ بہتر نہ ہو گا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی نص شرعی اس کے خلاف نہیں ہے تو پھر اختلاف رائے برداشت کرنا چاہئے۔ تامیم کے ذکر پر الحاد کا خیال کیوں آئے؟ علماء خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صنعتیں حکومت چلائے اور کپڑے کی صنعت کو ہاتھ نہ لگائے؟ میری مراد شرع کی بنیاد سے ہے، ویسے تامیم کے موافق مخالف ہر قسم کی دلیلوں سے اقتصادیات کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

(ج) ایک حدیث سبھی کو معلوم ہے، ان دنوں دینی رسائل میں اسے کہیں کہیں نقل کیا جاتا ہے، لیکن اس پر غور و فکر نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے خیال کی توثیق یا تردید ہو جائے۔ رسول اللہؐ سے درخواست کی گئی اور آپؐ نے بھٹے سے انکار کر دیا۔

روی انس قال : غلا السعر علی عهد النبی صلعم فقالوا یا رسول الله ! لو سعرت لنا ، فقال ان الله هو القابض الرازق الباسط المسعر ، و انی لأ رجو ان القی الله و لا

(۲) ملکی صنعتوں کے قیام کا وہ طریقہ کار جس کا ہلکا سا خاکہ اوپر بیان ہوا آج کی دنیا میں ترقی کے دین کا کلمہ شہادت بن چکا ہے۔ اس کی بابت جو ذرا لب کشائی کرے اسے یکسر ترقی کا منکر قرار دیا جائے گا۔ یہ صرف علماء کی شان ہے کہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں "لومۃ لائم" سے نہیں ڈرتے۔ ربوا بھی صنعتی ترقی کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اس مسئلہ میں کمزوری دکھائی، جمہور علماء نے ان کی ایک نہ چلنے دی لیکن (Protection) اور تسعیر (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کے اصول کو علماء بآسانی قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان دونوں کا محل استعمال یا کیفیت استعمال نہیں بلکہ بنیادی تصور تنقیح طلب ہے۔ یہ دونوں اقتصاد کے فطری عوامل کو درہم برہم کرتے ہیں۔ کیا یہ اسلام کے منافی نہیں؟ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صنعتی ترقی کی سرپرستی کی خاطر مولانا محمد ادریس میرٹھی دوسرے ملکوں سے قرضے لینا اور ان کو سود ادا کرنا ناگزیر (اور شاید جائز) سمجھتے ہیں (بینات دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۱) ایک ہی صفحہ بعد (ص ۲۳ پر) اس حدیث کا ذکر ہے: لعن رسول اللہ آکل الربوا و موکلہ ...؛ بظاہر مولانا سے سہو ہو گیا۔ اگر دوسرے ملکوں سے سودی قرضے لینا ناجائز قرار پائے تو صنعتی ترقی کی ایک بیساکھی تو پہلے ہی ٹوٹ کر گر جائے گی۔

يطالبنی احد بمظلمة ظلمتها اياه فی دم و لا مال ، رواه ابوداؤد ، والترمذی و صححه

روی ابوداؤد وغیرہ حدیث العلاء بن عبدالرحمٰن عن ابیه عن ابی هریره رضی الله عنه قال : جاء رجل الٰی رسول الله صلعم فقال یا رسول الله سعرلنا ، فقال بل الله یرفع و یخفض ، و انی لا رجوان القی الله ولیست لاحد عندی مظلمة

میرے خیال میں اسلام کے اقتصادی نظام کا حجر الزاویۃ یہ اصول ہے کہ حکومت مسعر کا منصب نہ اختیار کرے۔ جہاں تک ممکن ہو حکومت کو تسعیر کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالنی چاہئیں، بالفاظ دیگر اقتصاد کو حکومت کی دخل اندازی کے بغیر طبعی عوامل کے تابع رہنا چاہئے۔

ابن قیم الجوزیہ نے "الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ" (مصر، ۱۳۱۷ھ، ص ۲۲۳ و مابعد) میں تسعیر کی مختلف صورتوں سے بحث کی ہے۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جہاں خود غرض عناصر "التواطؤ علی الاغلاء" کے مرتکب ہوں وہاں حکومت مجبوراً دخل انداز ہو کر "التقویم بقیمۃ المثل" لازم کرے اور اقتصاد کے فطری عوامل کو سنبھالا دے۔ قیمۃ المثل حکومت اپنی طرف سے مقرر نہیں کرتی۔ قیمۃ المثل تو وہ ہوتی ہے جو السوق الحرۃ میں فطری عوامل کے تحت آپ اپنا تعین کرتی ہے۔ حکومت صرف قیمۃ المثل کی تشخیص و اکتشاف کرتی ہے، اور خود غرض عناصر کے تلاعب سے اسے بچاتی ہے۔

آج تسعیر کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ فطری عوامل کو کالعدم کر کے حکومت یہ اختیار سنبھال لیتی ہے کہ وہ قیمتوں اور اجرتوں کی، تجویز و تعین، کرے اس کی ضرورت یوں پیدا ہوتی ہے کہ حکومت خود در آمد و بر آمد پر پابندی لگاتی ہے، استبدادی طریقوں سے صنعتیں قائم کرتی ہے، صنعتوں کو وطنیت کے نام پر (Protection) دیتی ہے، مخصوص مصنوعات کو بالجبر مستہلکین کے گلے لگاتی ہے۔ من مانی قیمتیں رائج کرتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں سرمایہ دار صنعت کاروں کی من مانی اور بصورت دیگر خود حکومت کی اپنی من مانی (تب ہی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اجرتوں کا نیلام ہو رہا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں بڑھ بڑھ کر بولی بول رہی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ۵ اکتوبر ۷۰ء کے بعد اجناس کی قیمتوں کی سطح کیا ہوگی؟ اور دیگر فطری عوامل کس طرح اثر انداز ہوں گے؟ ان ہی صنعتوں کی خاطر یا تو تجارت کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے یا اپنے

نرغے میں رکھتی ہے۔ لائسنس پرمٹ کا سراسر گندا گھناؤنا سلسلہ " زادالطین بلتہ " کا مصداق ہے۔ الغرض آج حکومت جو کرتی ہے وہ تسعیر نہیں، بلکہ وہ ہے جس کے لئے تسعیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حکومت کی طرف سے بغی و فساد ہے جسے تسعیر کا نام دیا جاتا ہے۔

ابن قیم الجوزیہ نے اپنے زمانہ (آٹھویں صدی کے وسط) تک ان حالات کا جائزہ لیا ہے جن میں تسعیر کی ضرورت متصور ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے (Protection) کے لئے سند حاصل کی جائے۔ صرف ایک مثال ایسی ہے جس پر اسے کسی حد تک قیاس کیا جا سکتا ہے، دیکھئے اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے:-

ومن اقبح الظلم ایجار الحانوت علی الطریق او فی القریة باجرة معینة علی ان لا یبیع احد غیره فهٰذا ظلم حرام علی الموجر و المستأجر، وهو نوع من اخذ اموال الناس قهراً و اکلها بالباطل، و فاعله قد تحجروا سعةً فیخاف علیه ان یحجرالله عنه رحمته کما حجر علی الناس فضله ورزقه (ص: ۲۲٤)

یہ آج حکومت کو جو اختیارات دیئے جا رہے ہیں وہ "نوع من اخذ اموال الناس قہرا" اور "تحجر واسعا" کے ذیل میں آتے ہیں یا نہیں؟ جب ماہر اقتصادیات یہ بات تسلیم کر لیتا ہے کہ قہر اور حجر کی صورت پائی جاتی ہے تبھی تو وہ تامیم کی طرف جاتا ہے تاکہ اس قہر اور حجر سے اموال الناس سرمایہ دار کی تجوری میں نہ جائیں بلکہ حکومت کے واسطہ سے ان کا فائدہ عوام الناس کو واپس پہنچ جائے (میرا مقصد تامیم کی حمایت نہیں، تسعیر کا ابطال ہے۔)

یہ بھی حقیقت ہے کہ تسعیر کا سلسلہ لامتناہی ہے، ایک مرتبہ شروع ہو تو کبھی ختم ہونے نہیں آتا۔ تسعیر کے معنی یہ ہیں کہ اقتصاد کا جسم مزمن مرض میں مبتلا ہے، داخلی قوت مدافعت کھوچکا ہے، ایک ہمہ وقتی معالج دواؤں سے اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جس طرح دوائیں کثرت استعمال سے کچھ عرصہ بعد بے اثر ہو جاتی ہیں، اسی طرح ہر تسعیر کچھ عرصے کے بعد بیکار ہو جاتی ہے۔ جتنی تخطیط، تصمیم اور تسعیر آج مغربی ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن کسی طبقہ کو اطمینان چین نصیب نہیں، آئے دن یہ ہوتا ہے کہ حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور بڑے پیمانہ پر اقتصادی بحران اور مالی بدنظمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اجرت کا تعین کرے، حکومت اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرے، حکومت بٹائی کی شرح کا تعین کرے، یہ کوئی دیرپا اور اطمینان بخش حل نہیں معلوم ہوتا۔

نظامِ اراضی کا مسئلہ بھی خاصا غور طلب ہے، اور یہ بنیادی مسئلہ ہے اس معنی میں کہ آج جو فساد بپا ہے وہ محض سرمایہ داری کا نہیں بلکہ سرمایہ داری جاگیرداری کا گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری میں کبھی اتنی بے مروتی (احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات") نہ آتی اگر اس کے پس منظر میں جاگیر داری (Feudalism) نہ ہوتی۔ پہلے جاگیرداری زمینداری ایک انسان کو مجبور بناتی ہے پھر سرمایہ داری اس کی مجبوری کی بناء پر اس کی محنت کا استغلال کرتی ہے۔ یورپ میں یہی ہوا۔ یہی ہمارے یہاں ہو رہا ہے بالخصوص ایک زراعتی ملک میں جیسا کہ ہمارا ملک ہے، کسان کا تو کسان کا، صنعتی مزدور کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک نظام اراضی عدل کی بنیاد پر استوار نہ ہو۔

نظام اراضی کی بابت دو مذاہب بالکل جدا اور متمائز ملتے ہیں:۔

ایک یہ کہ غیر محدود ملکیت اراضی فرد کا شرعی حق ہے، خواہ عن طریق الشراء ہو یا عن طریق الاقطاع۔ اس حق کے بقاء اور استعمال کے لئے ضروری ہے کہ مزارعت بھی جائز ہو اور اکراء الارض بالذہب و الفضۃ بھی جائز ہو۔ چنانچہ ابن قیم الجوزیہ کہتے ہیں:۔

قال شیخ الاسلام وغیرہ من الفقہاء : والمزارعة احل من المئواجرة و اقرب الى العدل ، فانهما يشتركان فى المغرم و المغنم ، بخلاف المئواجرة فان صاحب الارض يسلم له الاجرة و المستاجر قد يحصل له زرع و قد لا يحصل و العلماء مختلفون فى جوازهما سواء كانت الارض اقطاعا اوغيره قال شيخ الاسلام ابن تيمية : و ما علمت احدًا من علماء الاسلام من الائمة الاربعة ولا غيرهم قال اجارة الاقطاع لا تجوز و ما زال المسلمون يئوجرون اقطاعاتهم قرنا بعد قرن من زمن الصحابة الى زمننا هذا حتى حدث بعض اهل زماننا فابتدع القول ببطلان اجارة الاقطاع و ولى الامر ياذن للمقطع فى الاجارة ، فانه انما اقطعهم لينتفعوا بها اما بالمزارعة و اما بالاجارة و من منع الانتفاع بها بالاجارة و المزارعة فقد أفسد على المسلمين دينهم و دنيا هم و الزم الجندو الامراء ان يكونوا اهم الفلاحين ، و فى ذالك من الفساد ما فيه (حوالہ سابقہ ص ۲۳۱ ، ۲۳۲)

دوسرا مذہب یہ ہے کہ المزارعة (بشروطها) جائز لیکن اکراء الارض بالذہب والفضۃ ناجائز

ابن حزم کہتے ہیں:۔

ان النبی صلعم قدم علیهم و هم یکرون مزارعهم کما روی رافع وغیره وقد کانت المزارع بلاشك تكری قبل رسول الله و بعد مبعثه هذا امر لا یمکن ان یشك فیه ذو عقل، ثم صح من طریق جابر و ابی هریرة و ابی سعید و رافع ظهیر البدری و آخر من البدریین و ابن عمر: نهٰی رسول الله صلعم عن کراء الارض فبطلت الاباحة بیقین لا شك فیه، فمن ادعی ان المنسوخ (اباحة الکراء) قد رجع، و ان تعین النسخ قد بطل، فهو کاذب مکذب قائل ما لا علم له به، وهذا حرام بنص القرآن، الا ان یأتی علی ذالك ببرهان، ولا سبیل الی وجوده ابدا الا فی اعطائها بجزء مسمی مما یخرج منها (کالثلث و الربع) فانه قد صح ان رسول الله صلعم فعل ذلك بخیبر بعد النهی بأعوام، و انه بقی علی ذلك الی ان مات علیه السلام (المحلی ۲۲٤/۸)

ابن حزم کے مذہب سے اختلاف سہی لیکن علم، اخلاص اور تقویٰ کے لحاظ سے ان کا درجہ ایسا تو نہیں کہ ان کی بات توجہ سے نہ سنی جائے۔ اگر آج کوئی ابن حزم کی سی بات کہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا علم ناقص ہے، یا اسے مغالطہ ہو گیا ہے لیکن یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ ملحد ہو۔

(+) خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہ ان دونوں مذاہب میں سے جو بھی راجح اور جو بھی مرجوح قرار پائے، یا یوں کہئے کہ جو بھی صحیح اور جو بھی باطل ہو دونوں کی ایک منطق ہے اور دونوں کی قوی یا ضعیف جیسی کچھ ہو سند ہے۔

یہ تجویز ایک سیاسی جماعت کے سیاسی منشور کا جزو ہے، معلوم نہیں علماء نے اس پر صاد کیا یا نہیں۔

(+) البعث الاسلامی، لکھنؤ میں الحاد کے لئے جگہ پانا غیر متصور ہے۔ عدد یولیو ۱۹۶۹ میں الاستاذ محمود ابوالسعود لکھتے ہیں:۔

الا رجح عندنا ان للمفردان یملك الارض الزارعیة، و ذلك لا شك استغلال لرأس المال، ولکن لیس له قطعا ان یکریها ولعمری ان اشتراط کراء

اب دیکھئے زمینداروں کا ظلم و ستم مسلم ہے، حقائق سے انکار ناممکن ہو گیا ہے، پہلا مذہب جس پر تعامل رہا ہے اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور بالاتفاق انسانیت سوز ہیں، ان حالات میں اب پہلے مذہب پر اڑے رہنا ناممکن ہو گیا ہے چنانچہ تحدید ملکیت اراضی کی تجویز پر "اسلامیت" کی مہر لگا دی گئی یہ تحدید ملکیت اراضی کی اساس شرعی ہے یا عقلی (یا محض سیاسی) ؟ کیا تحدید ملکیت اراضی کا مسئلہ کبھی ائمہ سلف کے سامنے آیا ہے؟ بہرحال یہ جو مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کی اور مشرقی پاکستان میں سو بیگھ کی حد تجویز کی جاتی ہے تو یہ حد تو شرع کی مقرر کردہ نہیں ہے۔

اب جب آپ نے تحدید ملکیت اراضی کے اصول کو عدل کا تقاضا سمجھ کر مان لیا تو اگر کوئی اس کی حد کچھ اور مقرر کرے تو شرعی نقطہ نظر سے اس کو ماننے میں تامل تو نہ ہوگا؟ اس کی حد ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ ہڑا لگے نہ پھٹکری زمینداری کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

یوں نہیں تو یوں لیجئے کہ تعامل غیر محدود ملکیت اراضی پر بھی رہا ہے۔ اور اکراء الارض کے جواز پر بھی۔ جب ملکیت اراضی کی تحدید قابل قبول ہے تو اکراء الارض پر پابندی لگانے میں کیا تامل ہے؟ اکراء الارض کا حق بھی چنداں مقدس نہیں، جاگیرداروں سے یہ حق واپس لینے کی تجویز ہے، اب صرف اتنی بات رہ گئی کہ غیر عامل غیر حاضر زمیندار کو (تعامل کی یادگار کے طور پر) باقی رکھا جائے یا اس کے جبر اور مفت کی کمائی کا کسی نہ کسی صورت دفعیہ کیا جائے۔

اسی ذیل میں یہ بھی قابل غور ہے کہ جس کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ ہو (اور مفروض یہ ہے کہ اس کی آمدنی حلال طیب ہے اور اس کا مال مال مزکی ہے) وہ بڑی بڑی صنعتوں کے حصص نہیں خرید سکتا۔ یہ اصول کہ مال کے استغلال اور تنمیہ کے ایک جائز طریقے پر پابندی لگائی جا سکتی ہے اس کی سند اور ائمہ سلف کے یہاں اس کی کیا نظیر کیا ہے جس پر اس کو قیاس کیا جا سکے؟ آج ایک طبقہ کے لئے چند صنعتوں میں شمولیت ممنوع ہوئی، کل یہ سلسلہ آگے بڑھے گا جب تک شریعت حد مقرر نہ کرے کسی کی عقل کو کیسے روکا جا سکتا

الارض نظیر مبلغ معین من ذهب او فضة لهوامعن فی الخطاء، و اقمن بالحکم بالتحریم لا بالتحلیل، و ابعد ما یکون عن منطق الاسلام السلیم وجدیران لا یکون صادراً عن رسول الله صلعم، اذ کیف یأبی ان توجر الارض بجزء مما یخرج منها، ثم یری ان یدفع المستاجر بصاحبها حصة معینة من ذهب اُو فضة؟ (ص ٤٦)

ہے؟ مال کے استغلال اور تنمیہ پر پابندی لگانا خطرناک ہے۔ اس کا نتیجہ وہی "کنز" ہو سکتا ہے جس پر "آیۃ الکنز" یاد آتی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس میں طبقاتی کشمکش کا اعتراف پنہاں ہے۔

سید محمد یوسف
شعبہ عربی۔ جامعہ کراچی ۱۳ جنوری ۷۰ء

جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف (صدر شعبہ عربی جامعہ کراچی) ہمارے ملک کے معروف دانشوروں میں سے ہیں، اور البلاغ اور مدیر کے دیرینہ کرم فرما ہیں، انہوں نے اپنے اس مضمون میں موجودہ معاشی صورت حال اور اس کی اصلاح سے متعلق چند فکر انگیز مسائل اٹھائے ہیں، اور کہیں کہیں ضمناً ان معاشی پروگراموں پر بھی مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ جو مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اب تک پیش کئے گئے ہیں، ساتھ ہی موصوف نے مدیر البلاغ کو اس بات کی اجازت بھی دی ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلق اپنا موقف پیش کرے۔ جوں کہ یہ مسائل وقت کی ضرورت کے مسائل ہیں، اور ان پر بحث و گفتگو البلاغ کے اولین مقاصد میں شامل ہے، اس لئے ہم اس سلسلے میں اپنی گزارشات بھی اس مضمون کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مضمون کے دو حصے ہیں، ایک صنعت و تجارت سے متعلق ہے، اور دوسرا زراعت سے۔ صنعت و تجارت کے بارے میں ان کے ارشاوات کا خلاصہ ـــــ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ ہے کہ سرمایہ داری کی موجودہ خامیوں کا اصل سبب صنعتوں کی تامین (Protection) ہے، در آمد و بر آمد کی پابندیوں کی وجہ سے وہ زر مبادلہ جو پوری قوم کا حق تھا، چند بڑے بڑے صنعت کاروں کے تصرف میں آجاتا ہے، وہ اس سے صنعتیں قائم کرتے ہیں، اور جب حکومت ان صنعتوں کو تحفظ دینے کے لئے در آمد پر پابندیاں لگاتی ہے تو بازار پر ان صنعت کاروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، اور وہ عوام سے من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق اس صورت حال کے دو علاج اب تک تجویز کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ صنعتوں کی تامیم (Nationalization) کی جائے (یعنی انہیں قومی ملکیت میں لے لیا جائے) تاکہ جو زائد نفع صرف صنعت کار اٹھا رہے ہیں، اس سے حکومت کے

واسطے سے تمام عوام مستفید ہوں، اور دوسرے یہ کہ صنعتوں کی موجودہ انفرادی ملکیت برقرار رہے، لیکن حکومت تسعیر (Rate Control) کا ایسا نظام نافذ کر دے جس میں کوئی شخص اجارہ داری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من مانی قیمتیں مقرر کر کے عوام پر دباؤ نہ ڈال سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس دوسرے حل (یعنی تسعیر) پر شرعی اور عقلی دونوں اعتبار سے اعتراض ہے، شرعی اعتبار سے انہوں نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں تسعیر کی ممانعت آئی ہے، اور عقلی اعتبار سے ان کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں "تسعیر" بغی و فساد کے علاوہ کچھ نہیں، اس کے ذریعہ وہ بھی یا تو سرمایہ داروں کے اشارے پر کھیلتی ہے یا "تسعیر" کے ذریعہ دوسرے سیاسی مقاصد حاصل کر کے عوام کو گمراہ کرتی ہے۔

دوسرے حل کو رد کر دینے بعد ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ تامیم (قومی ملکیت میں لینے) کا جو حل پیش کیا گیا ہے اس کو رد کرنے کی کوئی شرعی دلیل بھی ہے یا محض چند عقلی دلیلوں کی وجہ سے اسے علماء کی طرف سے رد کیا جا رہا ہے؟

ہماری رائے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا تو بالکل بجا ہے کہ لائسنس پرمٹ کا مروجہ نظام، در آمد و بر آمد کی پابندیاں اور صنعتوں کی تامین اجارہ داریوں اور ارتکاز دولت کا بہت بڑا سبب ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بھی البلاغ ماہ رمضان ۸۹ھ کے اداریے میں لکھا تھا۔

> "لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل ہو یہ رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔" (ص ۶)

لیکن اس صورت حال کا اصل علاج ہماری رائے میں نہ تامیم (Nationaliazation) ہے اور نہ تسعیر (Rate Control) - ہماری رائے میں اس صورت حال کا اصلی علاج، جو ایک اسلامی حکومت کا ہدف ہونا چاہئے یہ ہے کہ اجارہ داریوں کو توڑ کر آزاد مقابلہ

(Free Competition) کی فضا پیدا کی جائے جس میں قدرتی طور پر تمام اشیاء و خدمات (Goods and Services) کی قیمت ان کی ذاتی قدر (Intrinsicyalue) یا افادہ (Utility) کے مطابق متعین ہو سکے، اور ایسی فضا پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں:۔

(۱) تجارت کو بتدریج آزاد کیا جائے۔ اور در آمد و بر آمد کی پابندیاں اٹھالی جائیں۔

(۲) سود، سٹہ اور قمار کو ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳) معیشت کو سود کے بجائے شرکت و مضاربت کےاصولوں پر قائم کیا جائے جن کے ذریعہ بنک میں جمع ہونے والی عوامی دولت کا نفع عوام کو ہی پہنچے، صرف چند سرمایہ دارں کو نہیں۔

(۴) کارٹیل جیسے معاہدات کو ختم کیا جائے۔

تسعیر کی فقہی حیثیت:۔

"تامیم" کے مقابلے میں "تسعیر" (Rate Control) کی جو تجاویز علماء کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں، وہ اسلامی معیشت کے اصل منشاء کی تعبیر نہیں، بلکہ عبوری دور کے لئے محض ایک وقتی اور ہنگامی تجویز ہے، اسلام کا اصل منشاء بلا شک و شبہ یہی ہے کہ قیمتوں کی تعیین مصنوعی طریقوں کے بجائے آزاد رسد و طلب کے فطری عوامل کے ذریعہ ہو، اور اسی حقیقت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ان احادیث میں بیان کیا گیا ہے جوڈاکٹر صاحب نے تسعیر کے بارے میں نقل فرمائی ہیں، اور اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ "تسعیر" کو جائز قرار نہیں دیتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اجارہ داریوں کو توڑ کر آزاد مسابقت پیدا کرنا موجودہ حالات میں ایسا کام نہیں ہے جسے جھٹ پٹ انجام دے دیا جائے، در آمد و بر آمد کی موجودہ پابندیاں بلاشبہ تقسیم دولت میں ناہمواری کا باعث بن رہی ہیں، لیکن اگر فوری طور سے غیر ملکی تجارت کو بالکل آزاد کر دیا جائے تو اتنا زرمبادلہ کہاں سے آئے گا؟ ظاہر ہے کہ تجارت کو آزاد کرنے سے پہلے زرمبادلہ کی مشکلات کا کوئی حل نکالنا ہو گا، اور اس حل تک پہنچنے کے لئے لازماً کچھ وقت لگے گا، اور جب "روٹی" کے لئے "انتخاب" تک کا انتظار کرنا

لوگوں کے لئے ممکن نہیں تو اس عبوری دور کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ایسے طریقے تجویز کرنا ہوں گے جن کے ذریعہ عوام کو گرانی سے بچایا جا سکے۔ "تسعیر" ایک ایسا ہی طریقہ ہے جسے صرف اس وقت تک گوارا کیا جائے گا جب تک اجارہ داریاں مکمل طور پر ٹوٹ نہیں جاتیں، اور یہی وہ مرحلہ ہے جس میں ہمارے فقہاء نے "تسعیر" کی اجازت دی ہے، امام ابو حنیفہ "تسعیر کے مشہور مخالف ہیں، لیکن ایسے حالات میں ان کا کہنا بھی یہ ہے کہ:۔

فان کان أرباب الطعام یتحکمون و یتعدون عن القیمة تعدیا فاحشا و عجز القاضی عن صیانة حقوق المسلمین الا بالتسعیر فحینئذ لا بأس به بمشورة من اهل الرأی و البصیرة

اگر غلہ کے مالکان اجارہ دار بن کر قیمت مثل سے حد سے زائد تجاوز کرنے لگے ہوں اور قاضی تسعیر (نرخ مقرر کرنے) کے بغیر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے عاجز ہو جائے تو اہل رائے اور اہل بصیرت لوگوں کے مشورے سے ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں۔"

لیکن خود ان الفاظ سے بھی ظاہر ہے کہ تسعیر کی یہ اجازت مجبوری کے حالات میں صرف عبوری طور پر اختیار کی گئی ہے، لیکن جب اجارہ داریاں ختم ہو جائیں اور معیشت کا نظام اپنی طبعی رفتار پر آجائے تو تسعیر کو پسند نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اسلامی حکومت کی کوشش یہی ہو گی کہ وہ تجارت کو آزاد کر کے مسابقت کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں قیمتیں اور اجرتیں خود بخود منصفانہ طریقے سے متعین ہوں، اور تسعیر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، ہاں جب تک اس کوشش میں کامیابی نہ ہو اس وقت کی تسعیر کو ایک عارضی حل کے طور پر اختیار کیا جائے گا۔

اسلام اور درآمد و برآمد کی پابندیاں:۔

ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا ہے کہ: "خالص شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا جواز ہے کہ حکومت درآمد بند کر کے عام مستہلکین (صارفین) کو مجبور کرے کہ وہ ایک یا معدودے چند سرمایہ داروں کی مصنوعات انکی من مانی قیمت پر خریدیں؟ .... کیا رسالت یا خلافت راشدہ

ا۔ تکملہ فتح القدیر، ص ۲۷ المطبعہ الامیریہ مصر ۱۳۱۸ھ

کے عہد میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے جس پر اس مسئلہ کو قیاس کیا جائے؟"

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، ہمارے نزدیک یہ طریقہ کسی طرح بھی اسلامی اصولوں سے میل نہیں کھاتا بلکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر ملکی تجارت کو پابند بنانے کے بجائے آزاد چھوڑنے کو پسند فرمایا ہے، امام دار قطنی، بیہقی، ابو یعلیٰ اور طبرانی نے حضرت عائشہؓ سے اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن ابی عیاش بن ربیعہؓ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ:

"اطلبوا الرزق فی خبایا الارض"

رزق کو زمین کے تمام گوشوں میں تلاش کرو

نیز طبرانی نے حضرت شرجیل بن السمطؓ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ:

من تعذرت علیه التجارة فعلیه بعمان

"جس کے لئے تجارت مشکل ہو جائے اسے چاہئے کہ عمان چلا جائے۔

اور ایک روایت میں اسی طرح مصر جانے کا عمومی مشورہ مذکور ہے۔

(کنزالعمال حدیث نمبر ۴۱۷۴)

یہ تجارتی سفر درآمد و برآمد دونوں کے لئے ہو سکتا ہے، اس وقت کے تجار عموماً بیک وقت دونوں مقاصد کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ غرض عہد رسالتؐ یا عہد صحابہؓ میں تو کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں درآمد و برآمد پر باقاعدہ پابندی عائد کی گئی ہو، بلکہ اس کے خلاف صراحتیں ملتی ہیں، اب اگر خالص فقہی نقطہ نظر سے ان پابندیوں پر غور کیا جائے تو یہ عوام پر صریح ظلم ہے کہ جو دولت انہوں نے اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہے وہ صرف چند بڑے بڑے صنعت کاروں کے حوالے کر کے باقی سب کو کاغذ کے نوٹ پکڑا دیئے جائیں، یہ ایک طرح کا "حجر" ہے جس کے جواز کی کوئی صورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

یہی وجہ ہے کہ میرے علم و مطالعہ کی حد تک شاید کسی بھی مستند عالم دین نے اس ظالمانہ طریق کار کو جائز قرار نہیں دیا۔ ہاں علماء کے ذہن میں یہ دشواری ہمیشہ رہی ہے کہ موجودہ

۲۔ کنزالعمال ص ۱۹۷ ج ۲ دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۲ھ حدیث نمبر ۴۱۷۱

۳۔ کنزالعمال ص ۱۹۷ ج ۲ دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۲ھ حدیث نمبر ۴۱۷۳

حالات میں اگر تجارت کو بالکل آزاد کر دیا جائے تو زر مبادلہ کی کمی کا علاج کیا ہو گا؟ دراصل یہ ماہرین مالیات کا کام ہے کہ وہ اس دشواری کا حل نکالیں، اس وقت صرف علماء ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ماہرین معاشیات کی طرف سے بھی تامین (Protection) کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، شاید دنیا کا کوئی پڑھا لکھا خطہ ان آوازوں سے خالی نہیں ہے۔ اکثر معاشی ماہرین اس وقت آزاد تجارت کے حق میں نظر آتے ہیں، اس لئے مالیات کے ماہرین کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ اور اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ ان ہی کی مدد سے زر مبادلہ کی مشکلات پر قابو پائے گی، پورے نظام زر (Monetary System) پر نظر ثانی کر کے اسے طلائی معیار (Gold Standard) کے قریب لائے گی، اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل حل کرے گی۔

قومی ملکیت کا مسئلہ:

موجودہ سرمایہ داری کی پیدا کردہ مشکلات کا حل یہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ تجارت کو آزاد کر کے آزاد مسابقت کی مکمل فضا پیدا کی جائے۔ اور سود، قمار، اور سٹہ وغیرہ کو ممنوع کر کے دولت کو زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں گردش دی جائے، رہا وہ حل جو تامیم (قومی ملکیت) کی شکل میں حکمائے مغرب ہی نے تجویز کیا ہے، سو وہ صنعت علی ابالۃ کے سوا کچھ نہیں، یہ درست ہے کہ علماء نے اب تک تامیم کے خلاف جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ زیادہ تر عقلی ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے ابطال پر شرعی دلائل کچھ کم ہیں، بلکہ اس لئے کہ شرعی نقطہ نظر سے اس کا بطلان اتنا واضح ہے کہ اس پر بحث کرنا علماء نے ضروری نہیں سمجھا، یہاں یہ واضح رہے کہ گفتگو اس دولت کی تامیم میں ہو رہی ہے جو جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ ایسی دولت پر حکومت کا بالجبر قبضہ کر لینا واضح طور پر ظلم ہے، اور آیت ذیل کے تحت آتا ہے:

لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم

"تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ، الایہ
کہ دونوں کی رضامندی سے کوئی تجارت کا معاملہ ہو"

نیز خطبہ حجۃ الوداع کے یہ الفاظ بھی اس کی صراحۃً تردید کرتے ہیں کہ:۔

الا إن دمائكم و اموالكم وأعراضكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا فى بلدكم هذا فى شهركم هذا

یہ وہی "اخذ اموال الناس قہراً" ہے جس کے ناجائز ہونے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی کوئی شبہ نہیں ہے، لہٰذا تامیم کا ناجائز ہونا تو بالکل واضح ہے، عہد رسالتؐ سے لے کر اب تک کوئی قابل ذکر فقیہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس نے اسے جائز کہا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اسے جائز سمجھتا ہے تو نص شرعی پیش کرنا اس کے ذمہ ہے۔

اصل میں واقعہ یہ ہے کہ "قومی ملکیت میں لینے" کی تجویز کارل مارکس کے نظریہ قدر زائد (Surplus Value) پر مبنی ہے جس کی رو سے محنت کی اجرت کے علاوہ ہر ذریعہ آمدنی ناجائز ہے، اور صرف سود ہی نہیں، بلکہ منافع (Profit) اور کرایہ (Rent) بھی ناجائز ذرائع آمدنی میں شامل ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو تامیم (قومی ملکیت میں لینا) بلاشبہ ایک معقول بات ہے، اس لئے کہ صنعت کار جو آمدنی حاصل کرتا ہے، اور جس کے ذریعہ کارخانے لگاتا ہے، اس کا بیشتر حصہ سود، منافع اور کرایہ پر مشتمل ہوتا ہے، اور جب قدر زائد کے نظریہ کی رو سے یہ تمام ذرائع آمدنی ناجائز ٹھہرے تو اس کا پورا کارخانہ ہی ناجائز ہوا، لہٰذا اس کو چھین کر قومی ملکیت میں لے لینا قدر زائد کے نظریہ کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ ہے۔

لیکن اگر قدرے زائد کے نظریہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو صنعت کار کی وہ آمدنی جائز قرار پاتی ہے جو نفع یا کرایہ کے ذریعہ حاصل کی گئی ہے اور کسی کی آمدنی کو جائز قرار دے دینے کے بعد اسے تمام و کمال چھین لینا کسی بھی منطق کی رو سے جائز نہیں کہلا سکتا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اصل مسئلہ قومی ملکیت کا نہیں۔ بلکہ نظریہ قدر زائد کا ہے، ہمیں بنیادی طور پر یہ دیکھنا ہے کہ قدرے زائد کا نظریہ اسلام کی رو سے قابل قبول ہے یا نہیں؟ اگر قابل قبول ہے تو تامیم (قومی ملکیت) کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہو گا، اور اگر یہ نظریہ ہی بنیادی طور پر اسلام کے خلاف ہو تو تامیم (قومی ملکیت) کو جائز قرار دینے کے کوئی معنیٰ نہیں۔

اب نظریہ قدر زائد پر شرعی نقطہ نظر سے غور کیجئے تو وہ بنیادی طور پر ہی غلط نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس کی رو سے ذرائع آمدنی میں سے صرف اجرت جائز ہے، نفع اور کرایہ بالکل ناجائز ہے۔ حالاں کہ اسلام میں اجرت، نفع اور کرایہ تینوں کو جائز قرار دیا گیا ہے اور چار ذرائع تقسیم دولت میں سے صرف سود حرام ہے۔ نفع اور کرایہ کا جائز ہونا نصوص متواترہ سے ثابت ہے قرآن مجید میں جابجا تجارتی نفع کو "فضل اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے، بیع و شراء کی تمام

اقسام، اجارہ، شرکت، مضاربت اور دوسرے بہت سے شرعی عقود اسی نفع اور کرایہ کی حلت پر مبنی ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس پر دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ قدر زائد کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے تو صنعت کار کی صرف وہ آمدنی ناجائز قرار پائی جو سود، سٹہ، قمار یا کسی اور حرام طریقے سے حاصل ہوئی ہو، ایسی آمدنی کو ضبط کر لینا بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن جو آمدنی نفع اور کرایہ کی شکل میں اسے حاصل ہوئی ہو، وہ بغیر کسی شک و شبہ کے جائز ہے اور اسے جائز تسلیم کر لینے کے بعد اس میں سے صرف واجبات شرعیہ (زکوٰۃ عشر وغیرہ) حکومت وصول کر سکتی ہے، پوری آمدنی یا پورے کارخانے کو قومی ملکیت میں لے لینا کسی طرح بھی جائز نہیں کہلا سکتا۔

جو حضرات ہمارے زمانے میں قومی ملکیت کی تجویزیں زور شور کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ نظریہ قدر زائد کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کریں۔ "تامیم" کے ذکر پر الحاد کا خیال اسی لئے آتا ہے کہ تامیم کا تصور نظریہ قدر زائد پر مبنی ہے جو نصوص شرعیہ کے قطعی خلاف ہے، اور محل اجتہاد و اختلاف نہیں ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پروپیگنڈے کی طاقتوں نے "تامیم" کے "جواز" کو بھی خواہ مخواہ "ترقی پسندی" کے دین کا کلمہ شہادت بنا دیا ہے، اور ہمارے میں ایسے "اعجوبہ ہائے روزگار" بھی موجود ہیں جو اس "ترقی پسندی" کے شوق میں بیک وقت "ربوا" اور "سوشلزم" دونوں کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں، کہ علماء کے لئے "رجعت پسندی" اور "دقیانوسیت" کے طعنوں کی بارش کہیں زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس بات کے وہ قطعی نصوص کے معاملے میں ادنیٰ لچک کھا جائیں۔

رہی یہ بات کہ علماء خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صنعتیں حکومت خود چلائے سو غالباً اس کا اشارہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی اس تجویز کی طرف ہے جو البلاغ کی رمضان ۸۹ھ کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

> "کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کئے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو الخ"

غالبًا اس تجویز کے بعض الفاظ سے غلط فہمی ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب کے علاوہ بھی بعض حضرات نے اس طرف توجہ دلائی ہے، اس لئے ہم حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے صحیح منشاء کی تشریح کئے دیتے ہیں، دراصل اس تجویز میں جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جو کلیدی صنعتیں نیم سرکاری (Semi Government) نوعیت رکھتی ہیں، وہ حکومت ہی کی قائم کردہ ہیں، لیکن اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ ان صنعتوں میں بھی نجی شعبے (Private Sector) کے تمام تقریباً حصص بڑے بڑے سرمایہ داروں نے لے رکھے ہیں، اور اس طرح جو صنعتیں اپنی ابتداء ہی سے قومی ملکیت میں ہیں، ان سے بھی بڑے سرمایہ دار نفع اٹھا رہے ہیں۔ اگر حکومت اس صورت حال کو بدل کر یہ اعلان کر دے کہ ایسی صنعتوں کے حصص صرف ان لوگوں کو دیئے جائیں گے جن کی آمدنی ایک ہزار روپے سے کم ہے تو ان صنعتوں کے منافع میں عام آدمی شریک ہو سکیں گے، اور اس طرح بجائے اس کے کہ ان قومی صنعتوں کا منافع بھی سرمایہ دار اٹھائیں، یہ دولت عوام تک پہنچے گی۔

اس صورت حال کا شرعی جواز اس لئے ہے کہ یہ صنعتیں ابتداء ہی سے حکومت نے قائم کی ہیں، اور اس حیثیت سے اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس شخص سے چاہے شرکت کا معاہدہ کرے اور جس سے چاہے انکار کر دے، آج اگر میں کوئی کاروبار شروع کروں تو جس طرح مجھے اپنے شرکاء منتخب کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح یہ اختیار حکومت کو بھی ملے گا۔

یہ تجویز "تامیم" (قومی ملکیت میں لینے) سے بالکل مختلف ہے، کیوں کہ اس میں صنعت ابتداً کوئی غیر سرکاری شخص قائم کرتا ہے، پھر حکومت اس پر زبردستی قبضہ کر لیتی ہے۔

اس تشریح سے ڈاکٹر صاحب کا وہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس تجویز پر اپنے مضمون کے آخر میں کیا ہے کہ "یہ اصول کہ مال کے استغلال اور تنمیہ کے ایک جائز طریقہ پر پابندی لگائی جا سکتی ہے، اس کی سند اور ائمہ سلف کے یہاں اس کی نظیر کیا ہے جس پر اس کو قیاس کیا جا سکے؟" ـــــ مذکورہ تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کا مقصد مال کے استغلال اور تنمیہ (Investment) پر پابندی لگانا نہیں، بلکہ ہر کاروبار شروع کرنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ شرکت کا معاہدہ کرنے کے لئے افراد خود منتخب کرے، اس تجویز میں اسی اختیار کو استعمال کیا گیا ہے، آج بھی حکومت کسی شخص کے حصص قبول کرنے کے لئے بہت سی

شرائط عائد کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اسے استغلال اور تنبیہ پر پابندی نہیں کہا جا سکتا۔

زمین کا ٹھیکہ:

ڈاکٹر صاحب نے مضمون کے دوسرے حصے میں زراعت سے بحث فرمائی ہے اور اس سلسلے میں دو تجویزیں غور کے لئے پیش فرمائی ہیں، ایک یہ کہ مفاسد کے پیش نظر کراء الارض (زمین کا ٹھیکہ) کو ناجائز قرار دے دیا جائے دوسرے یہ کہ ملکیت زمین کی کوئی ایسی حد مقرر کر دی جائے جس سے زمینداری کا خاتمہ ہو جائے۔

جہاں تک کراء الارض بالذھب وا لفضۃ (روپیہ کے ذریعہ زمین ٹھیکہ پر دینا) کا تعلق ہے، یہ درست ہے کہ ابن حزم ؒ نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، لیکن ان کے اس مسلک کے خلاف صریح اور صحیح احادیث اس کثرت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں کہ ان کے حق میں رائے دینا بہت مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف امام ابو حنیفہ ؒ امام شافعی ؒ، امام مالک ؒ، اور امام احمد ؒ ہی نہیں، بلکہ امت کے تقریباً تمام علماء و فقہا ان کے خلاف ہیں، صحابہ کرام ؓ میں سے کوئی ایک صحابی بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس مسلک کو اختیار کیا ہو، قاضی شوکانی ؒ جو خود اہل ظاہر میں سے ہیں اور بہت سے معاملات میں ابن حزم ؒ کی تائید کرتے ہیں، اس مسئلے میں ابن منذر ؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

ان الصحابة اجمعوا علیٰ جواز کراء الارض بالذھب و الفضة و نقل ابن بطال اتفاق فقھاء الامصار علیه

> تمام صحابہ کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ سونا چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور ابن بطال ؒ نے تمام علاقوں کے کا اسپر اتفاق نقل کیا ہے۔ یہاں تک کہ جس حدیث کے اطلاق سے ابن حزم ؒ نے استدلال کیا ہے اس کے روایت کرنے والے تمام صحابہ ؓ "کراء الارض" کے قائل ہیں، رہا علامہ ابن حزم ؒ کا معاملہ سو ان کے بارے میں پوری علمی دنیا جانتی ہے کہ وہ بہت سے معاملات میں ان کے تفردات کو کبھی قبول نہیں کیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ابن حزم ؒ کا مسلک اختیار کرنے کی تجویز زمینداروں کے ظلم و ستم کی بناء پر پیش کی ہے، لیکن اگر اس تجویز پر بالفرض عمل کیا جائے تو اس کی رو سے مزارعت جائز

رہے گی اور ٹھیکہ ناجائز ہو جائے گا، حالاں کہ ہمارے معاشرے میں زمینداروں کے ظلم و ستم کا اصل نشانہ مزارعین ہوتے ہیں، ٹھیکہ پر زمین لے کر کاشت کرنے والے اول تو ہمارے یہاں کم ہیں، دوسرے ان پر زمیندار اتنے قابو یافتہ نہیں ہوتے کہ انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکیں، ان کا بس تو ان غریب مزارعین پر چلتا ہے جن کی حیثیت سالہا سال کے غلط رسم و رواج کے سبب زمینداروں کی رعیت کی سی ہو گی ہے لہٰذا موجودہ معاشرے میں عوامی مصالح کے لحاظ سے بھی اس تجویز کا کوئی مؤثر فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ زمینداروں کے موجودہ ظلم و ستم کا صحیح علاج تو ہماری نظر میں وہی آتا ہے جو البلاغ کے رمضان ۸۹ھ کے اداریئے میں بیان کیا گیا ہے۔

تحدید ملکیت اراضی

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زمین کی تحدید ملکیت کا سوال اٹھایا ہے، اس سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ تحدید ملکیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے کوئی حد مقرر کر دی جائے جس کے پاس اس سے زائد زمین ہو وہ چھین لی جائے، اور آئندہ کسی کو اس سے زیادہ اراضی رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تحدید ملکیت کا یہی مفہوم آج کل عموماً سمجھا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض سوشلزم کی مخالف جماعتیں بھی یہی حل پیش کر رہی ہیں، لیکن ہماری رائے میں یہ حل نہ تو شریعت کے مطابق ہے اور نہ موجودہ حالات میں اس سے تحدید کا مقصد حاصل ہو گا۔ سابق صدر ایوب صاحب کے زمانے میں بھی اراضی کی حد پانچ سو ایکڑ مقرر کر دی گئی تھی، لیکن کیا آج بھی ایک ایک شخص کے تصرف میں ہزاروں ایکڑ زمین نہیں ہے؟ اس تحدید کا نتیجہ صرف یہ ہوا ہے کہ بڑے بڑے زمینداروں نے اپنی زمین کے مختلف حصے اپنے ایسے کاشتکاروں اور ہاریوں کے نام منتقل کر رکھے ہیں جنہیں آج تک یہ علم بھی نہیں ہے کہ سرکاری کاغذات میں ان کے نام پر کوئی زمین لکھی ہوئی ہے۔

اس کے برخلاف تحدید ملکیت کے کچھ ایسے طریقے بھی ہیں جن میں گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تو ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جائے گی، لیکن ان کو اختیار کرنے کا نتیجہ مآل کار یہی ہو گا کہ ایک طرف بڑے بڑے زمیندارے ٹکڑے ہو ہو کر خود بخود مناسب حدود میں آجائیں گے، اور دوسری طرف ان زمینداروں کی وجہ سے جو نقصانات غریب عوام کو پہنچ رہے ہیں، انکا انسداد ہو جائے گا۔ دولت خواہ زمین کی شکل میں ہو یا روپیہ کی شکل میں، اسلام نے

اسے مناسب اور معقول حدود میں رکھنے کے لئے اسی قسم کے اقدامات پر زور دیا ہے اور کمیت کے اعتبار سے کہیں بھی اس کی کوئی متعین حد مقرر نہیں کی۔ لہٰذا جن جماعتوں نے سو یا دو سو ایکڑ کی حد مقرر کی ہے، ہماری نظر میں ان کی یہ تحدید بھی شریعت کے خلاف ہے، کتاب و سنت اور امت کے چودہ سو سالہ تعامل میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، البتہ موجودہ حالات میں مندرجہ ذیل اقدامات ایسے ہیں جن کے ذریعہ بڑی بڑی زمینیں خود بخود تقسیم ہو سکتی ہیں۔

(۱) جن زمینوں میں وراثت سالہا سال سے جاری نہیں ہوئی، ان میں اگر اسلامی احکام کے مطابق وراثت ٹھیک ٹھیک جاری کر دی جائے .... تو بہت سی زمینیں تقسیم ہو کر اپنے صحیح مستحقین تک پہنچ جائیں گی۔

(۲) جس زمین کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس کے قابض نے ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے، اسے واپس لے کر عوام میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۳) جتنی زمینیں اس وقت ناجائز طور پر رہن رکھی ہوئی ہیں (اور اس وقت رہن کی تقریباً تمام صورتیں ناجائز ہی ہیں) انہیں چھڑا کر واپس قرض دار کو دلوایا جائے۔

(۴) آئندہ اسلام کے قانون وراثت کی پوری پابندی کرائی جائے۔

(۵) انتقال جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس قسم کے قانونی احکام کے ذریعہ ہی چند سالوں میں بڑی بڑی زمینیں مناسب اکائیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

پھر یہ بات ہر مرحلہ پر یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں ہر بیماری کا علاج قانون کا ڈنڈا نہیں ہوتا، طبقاتی کشمکش کو ہوا دے کر فریقین میں ضد اور عناد پیدا کرنے کے بعد حالات کی اصلاح بہت مشکل ہے، اس کے بجائے اگر منافرت کی آگ کو ٹھنڈا کر کے قانون کے علاوہ اخلاق سے بھی کام لیا جائے تو بہت سے مسائل محض رضاکارانہ بنیاد پر بھی حل ہو سکتے ہیں، جو قوم ۱۹۵۸ء میں اپنی دولت کے پوشیدہ ذخائر خود بخود ظاہر کر سکتی ہے، اگر اسے پوری طرح اعتماد میں لے کر اس کی ذہنی تربیت کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زائد از ضرورت زمینیں بھی خوش دلی کے ساتھ پیش نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ مالکان زمین کو رضامند کر کے ان سے بعض قطعات زمین معاوضہ کے ساتھ بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے

دور حکومت میں اس قسم کی ضرورت پیش آئی تھی تو انہوں نے جبراً لوگوں کی زمینیں چھیننے کے بجائے بجیلا کے پورے قبیلہ کو اخوت کی بنیاد پر راضی کیا، اور بعض سے بلامعاوضہ اور بعض سے معاوضہ کے ساتھ زمینیں حاصل کیں ا۔ یہ طریقہ آج بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے اپنا نقطہ نظر نہایت اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے، اگر دوسرے اہل علم حضرات ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال فرمانا چاہیں تو البلاغ کے صفحات حاضر ہیں۔

اللهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه

ا۔ ابو عبیدؒ: کتاب الاموال رقم نمبر ۱۵۴

سوشلزم اور غریب عوام

گذشتہ مضامین میں اسلامی نظام معیشت کے وہ موٹے موٹے نکات بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا منصفانہ مطالعہ انسان کو اس نتیجے تک پہنچانے کے لئے کافی ہے کہ اگر اسلام کا نظام زندگی نافذ ہو تو تقسیم دولت کی یہ ظالمانہ اونچ نیچ نہ پیدا ہو سکتی ہے، نہ باقی رہ سکتی ہے، ان نکات کی روشنی میں اس سوال کا بہرحال تشفی بخش جواب مل جاتا ہے کہ اسلام ایک غریب انسان کی معاشی ضروریات مہیا کرنے کے لئے کیا نظام تجویز کرتا ہے؟ اور اس سے عام خوشحالی کی فضا کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

اب ہم اس بات کا پورا حق رکھتے ہیں کہ جو لوگ اس ملک میں سوشلزم لانا چاہتے ہیں، ان سے یہ سوال کریں کہ سوشلزم ایک غریب انسان کو کیا دیتا ہے؟ اس سے ایک آدمی کو کیا معاشی فائدہ پہنچے گا؟ اس کے قیام سے دولت کس طرح غریبوں کے ہاتھ میں پہنچ سکے گی ــــ؟ اور اس کی حکومت میں دولت کے ایک جگہ سمٹ کر رہ جانے کا انسداد کس طرح ہو گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کے حامیوں کے پاس ان سوالات کا کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کی تحریک خالصتہً ایک منفی تحریک ہے جس نے آج تک اپنے معاشی نظام کا کوئی سوچا سمجھا مثبت خاکہ پیش نہیں کیا۔ اس نے معاشی مساوات کے نعرے تو بہت لگائے ہیں، غریبوں سے ہمدردی کے دعوے بھی بے شمار کئے ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و ستم کے خلاف نفرت پھیلانے کا کارنامہ بھی خوب انجام دیا ہے، لیکن مثبت طور پر یہ کہیں نہیں بتایا کہ اس ظلم و ستم کا علاج کس طرح ہو گا؟ غریبوں کے سرمایہ دارانہ نظام کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی عملی شکل کیا ہے؟ اور سوشلزم کے تحت معاشی مساوات کیوں کر قائم ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو ہمارے اس دعوے پر حیرت ہو اس لئے کہ سوشلزم نے دنیا بھر میں اپنا تعارف ایک معاشی تحریک کی حیثیت سے کرایا ہے، اور پروپیگنڈے

کی ساری طاقتیں استعمال کر کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمایہ داری کے ظلم و جور کا واحد مد مقابل سوشلزم ہے اور اگر اس کو اختیار کر لیا جائے تو سرمایہ داری کی تمام لعنتیں دور ہو سکتی ہیں۔

لیکن جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس بات سے پوری طرح باخبر ہیں کہ یہ تاثر خالصۃً پروپیگنڈے کی کرامت ہے، ورنہ سوشلزم نے سرمایہ داری کے خلاف زبانی نفرت کے اظہار سے زیادہ کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ یقین نہ آئے تو سوشلسٹ لٹریچر کا مطالعہ کر کے دیکھئے، وہ اول سے لے کر آخر تک اس قسم کے جملوں سے بھرا ہوا نظر آئے گا کہ:-

"سرمایہ داروں نے غریب مزدوروں کا خون چوس رکھا ہے" ــــ "پوری قوم کی دولت چند خاندانوں میں جمع ہو کر رہ گئی ہے" ــــ "سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا" ــــ "کارخانہ مزدور کا اور زمین کسان کی ہونی چاہئے" ــــ "مزدور دولت پیدا کرتا ہے، مگر سرمایہ دار اسے لوٹ لے جاتا ہے" ــــ "عوامی حکومت میں کروڑ پتیوں کی کوئی گنجائش نہیں" ــــ "ہم مزدوروں کو ان کے حقوق دلوا کر رہیں گے۔" وغیرہ وغیرہ!

سوشلسٹ حضرات کا سارا لٹریچر اسی قسم کے بے شمار جملوں اور ان کی تشریحات سے لبریز تو نظر آئے گا، لیکن سوشلزم کے پاس اس صورت حال کا واقعی علاج کیا ہے؟ اس میں دولت کی یہ اونچ نیچ کس طرح ختم ہو گی؟ وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد مزدور اور کسان اپنی مشکلات سے کیوں کر نجات پائیں گے؟ ان کی حکومت قائم ہونے کی عملی شکل کیا ہو گی؟ دولت کی مساوات کس طرح پیدا ہو سکے گی؟ یہ سب وہ سوالات ہیں جو سیاسی نعروں کی گونج میں گم ہو کر رہ گئے ہیں، اور اگر کوئی شخص معقولیت کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہے تو سوشلسٹ عناصر کے پاس اس کے لئے "امریکی ایجنٹ" کے فتوے کے سوا کوئی جواب نہیں ہے۔

سوشلزم کی بنیاد کارل مارکس کی کتاب "داس کیپٹال" پر ہے جسے اشتراکیت کی بائبل سمجھا جاتا ہے، لیکن تین جلدوں کی اس ضخیم کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنا چاہئے۔ وہ تمام تر سرمایہ دارانہ نظام پر فلسفیانہ تنقید سے بھری ہوئی ہے۔ اور چند مبہم اشاروں کے سوا اس میں

کوئی مثبت معاشی پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔

لے دے کر اگر سوشلسٹ عناصر کے پاس سرمایہ وارانہ نظام کے خلاف کوئی مثبت تجویز ہے تو وہ یہ ہے کہ تمام وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لے کر منصوبہ بند معیشت (PLANNED ECONOMY) قائم کی جائے جس میں وسائل کا استعمال اور ان کے درمیان دولت کی تقسیم حکومت کی منصوبہ بندی کے ماتحت ہو۔ بس یہ ایک تجویز ہے جسے اس شان کے ساتھ پھیلایا جا رہا ہے کہ گویا "قومی ملکیت" کوئی طلسماتی چراغ ہے جس کے روشن ہوتے ہی ظلم و ستم کی ساری تاریکیاں کافور ہو جائیں گی، اور اس کے بعد مزدور اور کسان کے گھر میں اجالا ہی اجالا نظر آئے گا۔ مزدوروں اور کسانوں کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ زمینوں اور کارخانوں کے قومی ملکیت میں آ جانے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے مالک بن جاؤ گے، اور تم پر کسی سرمایہ دار کی بالا دستی قائم نہیں رہے گی۔ اور یہ بلاشبہ اشتراکی پروپیگنڈے کا کمال ہے کہ اس سفید جھوٹ کو اس نے ایسی شدت کے ساتھ پھیلایا ہے کہ "قومی ملکیت" کا یہی مفہوم عام طور سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض سوشلزم کے کٹر مخالفین بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کبھی کبھی قومی ملکیت کا نعرہ لگا دیتے ہیں، اور ذہن اس رخ پر سوچنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے کہ "قومی ملکیت" سے مزدور بے چارہ کس طرح کارخانے کا مالک ہو جائے گا؟ اور زمینیں غریب کسان کی ملکیت میں کیسے آ جائیں گی؟

فرض کیجئے کہ اگر ملک کی زمینوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے تو اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ ہے کہ ساری زمینیں اور کارخانے افراد کی نجی ملکیت سے نکل کر حکومت کے قبضے میں چلے جائیں گے، اور حکومت ہی ان تمام وسائل پیداوار کی مالک ہو گی سوال یہ ہے کہ اس اقدام سے مزدور اور کسان کے حق میں آقاؤں کی تبدیلی کے سوا کیا فرق پڑا؟ پہلے کارخانوں کا ک سرمایہ دار تھا اور وہ مزدور سے کام لے کر اسے اجرت دیتا تھا، اب کارخانوں کی مالک ومت ہو جائے گی اور وہ بھی اس سے کام لے کر اجرت دے گی، کارخانے کی پالیسی میں نہ پہلے اس کا دخل تھا نہ اب ہو گا، کارخانے کے منافع میں نہ پہلے اسے مالکانہ حقوق حاصل تھے نہ اب ہوں گے، تنخواہوں کا تعین نہ پہلے اس کی آزاد مرضی پر ہوتا تھا، نہ اب ہو سکے گا۔ پھر آخر میں مساوات اور خوش حالی کی وہ کون سی جنت ہے جو اسے پہلے آقا کی غلامی میں حاصل نہیں تھی، اور اس نئے آقا کی غلامی کر کے حاصل ہو جائے گی؟

کہا جاتا ہے کہ سوشلزم میں چوں کہ حکومت بھی مزدوروں کی حکومت ہو گی، اس لئے

کارخانوں کو اپنے قبضے میں لانے کے بعد وہ یقیناً مزدوروں کے ساتھ انصاف کرے گی، اور موجودہ سرمایہ داروں کی طرح ان کو جائز حقوق سے محروم نہیں کر سکے گی ــــ لیکن آیئے ذرا یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ سوشلسٹ نظام میں "مزدوروں کی حکومت" کا کیا مطلب ہے؟

اشتراکی پروپیگنڈے نے سادہ لوح عوام کے دل میں "مزدوروں کی حکومت" کا تصور بھی کچھ اس طرح بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے اس نظام کے تحت مشین چلانے والے مشین مین اور ہل جوتنے والے کسان یک بیک حکومت کی کرسیوں پر جا بیٹھیں گے اور ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن کر ملک بھر کی جھونپڑیوں کو محلوں میں تبدیل کر دیں گے، لیکن واقعات کی دنیا میں آکر دیکھئے کہ اس "مزدور کی حکومت" کا عملی نقشہ کیا بنے گا؟ ہوگا صرف یہ کہ ملک کے دس کروڑ مزدوروں اور کسانوں میں سے صرف چند افراد پر مشتمل ایک پارٹی بنے گی، جس میں ملک کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں میں سے بمشکل تین چار فیصد آدمی شریک ہو سکیں گے، پھر یہ پارٹی اپنے اندر سے انتخاب کر کے بیس پچیس آدمیوں پر مشتمل ایک وزارت بنائے گی، اور یہ بیس پچیس آدمی ہی عملاً سارے ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے، ان ہی کے قبضے میں ملک بھر کے کارخانے ہوں گے، ان ہی کے تسلط میں ملک کی ساری زمینیں ہوں گی، وہی اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ مل کر ساری پالیساں بنائیں گے۔ وہی عام مزدورں اور کسانوں کی اجرتیں اور اشیاء کی قیمتیں متعین کریں گے، اور رہی بیچاری وہ پارٹی جس نے اب بیس پچیس افراد کو منتخب کیا تھا، سو اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سال بھر میں ایک مرتبہ اپنا اجلاس (۱) منعقد کر کے حکومت کی پالیسیوں کی تصویب کر دے یا زیادہ سے زیادہ کسی فیصلے پر تنقید کر کے گذر جائے اور بس!

اب رہے وہ کروڑوں مزدور اور کسان جنھوں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے دھوکے میں اپنا سب کچھ اس پارٹی کے حوالے کر دیا تھا، سو حکومت کی پالیسیوں میں ان کے کسی ادنیٰ دخل کا تو سوال ہی کیا ہے، ان بیچاروں کی مجال نہیں ہے کہ وہ حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف زبان کو حرکت بھی دے سکیں، لہٰذا اگر وہ بیس پچیس ارباب اقتدار جو ملک کے سارے

---

(۱) بلکہ ارباب اقتدار کسی وجہ سے مناسب نہ سمجھیں تو سالہا سال تک پارٹی کا اجلاس منعقد نہیں ہوتا، روس کی مثال ہر شخص کے سامنے ہے۔

کارخانوں، ساری زمینوں، دولت کے خزانوں اور پیداوار کے تمام وسائل کے تنہا ٹھیکہ دار ہیں، پارٹی کے چند ہزار افراد کو خرید لیں تو ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی متنفس نہیں ہے جو ان کے فیصلوں کے خلاف دم بھی مار سکے۔

اس صورت حال کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہم سابقہ دور حکومت میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ کروڑوں عوام اپنی تقدیر چند ہزار بی ڈی ممبروں کے حوالے کرنے کے بعد کس بری طرح بے بس ہو جاتے ہیں، اور یہ بی ڈی ممبر اور ان کی منتخب کی ہوئی اسمبلیاں حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کی سوا کوئی کام نہیں کر سکیں، فرق یہ ہے کہ "بنیادی جمہوریت" کے اس نظام میں کروڑوں عوام کے بیشتر اختیارات سلب ہو جانے کے باوجود انہیں دوسری سیاسی جماعتیں بنانے، ان کے تحت جلسے جلوس منعقد کرنے، ہڑتال اور مظاہرے کرنے کا اختیار فی الجملہ حاصل تھا، اور اسی اختیار کی بدولت وہ دس سال بعد حکومت تبدیل کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے۔ لیکن سوشلسٹ نظام میں نہ انہیں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی اجازت ہوگی، نہ ہڑتال اور مظاہرے کرنے کی، اور نہ آزادانہ جلسے جلوس منعقد کرنے کی، لہٰذا ان کی حیثیت بالکل اس پرندے کی سی ہوگی جسے جال میں پھانسنے کے ساتھ ساتھ اس کے پر بھی کاٹ دیئے گئے ہوں، تاکہ وہ مقید ہونے کی حالت میں پھڑپھڑانے کی آزادی سے بھی محروم ہو جائے۔

یہ ہے وہ حکومت جسے "مزدوروں کی حکومت" کا نام دے کر مزدوروں سے کہا جا رہا ہے کہ اسے قائم کرنے کے لئے اپنے جان و مال کی قربانیاں ضرور پیش کرو، جو اس حکومت کے قیام میں آڑے آئے اسے "سامراج کا ایجنٹ" اور "مزدور دشمن" قرار دو اور اس کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دو۔

"قومی ملکیت" اور مزدوروں کی حکومت کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب آپ ایک مزدور کے نقطہ نظر سے سوچئے کہ اس نظام میں مزدور کا کیا حشر کیا ہو گا؟ فرض کیجئے کہ اس نظام کے تحت ایک مزدور کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری اجرت میری محنت کے مقابلے میں کم ہے، اور اس میں اضافہ ہونا چاہئے وہ اپنی اجرتیں بڑھوانے کے ۔لئے جدوجہد کرنا چاہتا ہے تو سوشلزم کی اس نام نہاد "مزدور حکومت" میں اس کے لئے کیا راستہ ہے؟ ٹریڈ یونین وہ نہیں بنا سکتا، ہڑتال وہ نہیں کر سکتا، مظاہرہ کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی اسے اجازت نہیں، اس لئے کہ

سوشلسٹ نقطہ نظر سے یہ یونین سازی، ہڑتال اور مظاہرے تو "سرمایہ داری" کے دور کی یادگاریں تھیں، جب حکومت خود ان مزدروں کی قائم ہو گئی تو اب ان "مزدور دشمن سرگرمیوں" کی اجازت کہاں؟

اب اس کے لئے دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ تن تنہا کارخانے کے ڈائرکٹروں کے پاس جائے اور ان کی خدمت میں اجرت بڑھانے کی درخواست پیش کرے، لیکن یہ ڈائرکٹر کوئی سرمایہ دارانہ نظام کا مل مالک تو ہے نہیں جو اپنے اختیار سے اجرتوں میں کمی بیشی کر سکے، اس کا پاس ٹکا سا جواب یہ ہے کہ اجرتیں بڑھانا میرے اختیار میں نہیں، یہ کام تو "مزدور حکومت" کا ہے، اب مزدور کے لئے یہی راستہ ہے کہ وہ "اپنی حکومت" کے دروازے پر دستک دے، لیکن اول تو جو حکومت "مزدورں کے وسیع تر مفادات" کے تحفظ اور "مزدوردں کی عالمی حکومت" کے قیام جیسے اہم کاموں میں شب و روز مشغول ہے، اسے اپنی طرف متوجہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، پھر اگر فرض کیجئے کہ یہ مزدور مرمار کر متعلقہ افسر یا وزیر تک پہنچ ہی جائے تو اس کے پاس یہ عذر ہے کہ دنیا بھر میں "مزدوروں کی حکومت" قائم کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عام مزدور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی پیش نہ کریں، لہٰذا "مزدور مفاد" کا تقاضا یہ ہے کہ اجرتیں نہ بڑھائی جائیں، اور مزدوردں کو چاہئے کہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر غیر اشتراکی دنیا کے ان مزدوروں کو "مزدور حکومت" کی پناہ میں لانے کی کوشش کریں جو ابھی تک سامراج کی چکی میں پس رہے ہیں۔

لیجئے! اس بے چارے مزدور کی آخری امید بھی ختم ہو گئی، اب اگر یہ سمجھتا ہے کہ "مزدور حکومت" اسے بے وقوف بنا رہی ہے تو اس کے لئے نجات کا کوئی راستہ نہیں، ملک بھر میں کوئی سیاسی جماعت موجود نہیں ہے جس سے وہ جا کر فریاد کر سکے، نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے کارخانے میں بھی نہیں جا سکتا، اس لئے کہ وہ کارخانہ بھی "مزدور حکومت کا ہے" اس پیشے کو بھی خیرباد نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ "مزدور حکومت" نے اسے یہ پیشہ سوچ سمجھ کر دیا ہے، اور جب تک وہ خود اسے اس پیشے سے ہٹنے کی اجازت نہ دے وہ پیشہ نہیں چھوڑ سکتا، لہٰذا اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک حکومت کی مقرر کی ہوئی اجرت پر کام کرتا رہے، اور آئندہ اجرت بڑھانے کا نام بھی زبان پر نہ لائے ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے "مزدور دشمن سرگرمیوں" اور "سامراج کی

جاسوسی" کے الزام میں گرفتار کر کے جیل خانے میں بھیج دیا جائے۔

یہ ہیں ایک مزدور کے حق میں "قومی ملکیت" اور "سوشلسٹ حکومت" کے نتائج، اگر واقعات کی یہ تصویر کسی کو درست معلوم نہیں ہوتی تو وہ تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ بتلائے کہ سوشلسٹ حکومت میں مزدور اپنی اجرت بڑھوانا چاہیں، پیشہ تبدیل کرنا چاہیں یا اپنے دوسرے حقوق حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے طریق کار کیا ہوتا ہے؟ کارخانوں کے منافع میں ان کے لئے معقول حصہ ملنے کی ضمانت کیا ہے؟ حکومت اگر بددیانتی یا بے وقوفی سے کوئی ظالمانہ پالیسی اختیار کر لے تو اس کو تبدیل کیسے کرایا جا سکتا ہے؟ حکومت کے وسیع اختیارات پر مزدوروں کی طرف سے کون سی روک مقرر کی جاتی ہے؟ اجرتوں کا تعین کون اور کس معیار پر کرتا ہے؟ اور اس تعین میں عملی طور پر کام کرنے والے مزدوروں کی رائے کس حد تک مؤثر ہوتی ہے؟ جس وقت تک ان سوالات کا معقول اور مدلل و تشفی بخش جواب فراہم نہ کیا جائے، اس وقت تک محض "مزدوروں کی حکومت" کے نام سے مزدور کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام کے تحت جو معاشی اصلاحات پچھلے شمارے میں تجویز کی گئیں، ان کی رو سے مزدور براہ راست کارخانوں کی ملکیت میں حصہ دار بنیں گے، اور حصص کے مالک بن کر نفع میں متناسب طور سے شریک ہوں گے، ان کی آمدنی کے دروازے زیادہ اور عمومی ارزانی اور معاشرت کی سادگی کی وجہ سے اخراجات کے راستے کم ہوں گے، پھر اگر واقعتہً سوشلسٹ حضرات کے دل میں مزدوروں اور غریبوں کا ادنیٰ سا درد ہے تو وہ معقولیت کے ساتھ یہ بتلائیں کہ مزدوروں کی فلاح کے اس راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے جو ان کے حق میں مفید بھی ہے اور اسلام کے مطابق بھی؟ اور اس طریقے کو چھوڑ کر سوشلزم کے جابرانہ نظام ہی کو مسلط کرنے کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ اس سلسلے میں مزید کچھ گزراشات ہم انشاء اللہ آئندہ پیش کریں گے۔

واللہ الموفق والمعین!

اسلام، جمہوریت اور سوشلزم

"اسلام ہمارا مذہب ہے
جمہوریت ہماری سیاست ہے
اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔"

یہ وہ نعرہ ہے جسے پچھلے دنوں ہمارے ملک کی بعض سیاسی جماعتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا ہے۔ اس نعرہ کی پہلی ہی سطر میں "اسلام" کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس میں "اسلام" کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس نعرے میں "اسلام" کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا ہو۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تین جملوں کو پڑھ کر "اسلام" کا جو تصور ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اسلام بھی عیسائیت، یہودیت یا ہندو مت کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں یا اخلاق کے چند مجمل اصولوں کا نام ہے اور زندگی کے دوسرے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی شخص عبادت کے چند خاص طریقوں کو اپنا لے تو اس کے بعد وہ اپنی حکومت اور اپنی معیشت کو جس نظام کے ساتھ بھی وابستہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ وہ مسجد میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیمات کا پابند ہے، لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یا اپنے لئے رزق کی تلاش کے وقت اسلام نے یا تو اسے رہنمائی دی ہی نہیں ہے، یا اگر دی ہے تو وہ (معاذ اللہ) اتنی ناقص اور بیکار ہے کہ اس کے ذریعہ اس کے سیاسی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوتے۔ لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنی سیاست میں جمہوریت سے، اور اپنی معیشت میں سوشلزم سے "روشنی" حاصل کرے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کا مفہوم یہی کچھ ہے تو پھر یہ دعوے آپ فضول کرتے ہیں کہ

"اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اور اس میں انسان کی تمام موجود پریشانیوں کا حل موجود ہے۔"

پھر تو کھل کر آپ کو کہنا چاہئے کہ اسلام نے عبادات و عقائد کے علاوہ زندگی کے کسی مسئلہ میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی اور (معاذ اللہ) ہم اپنے سینوں میں قرآن رکھتے ہوئے بھی کارل مارکس اور ماؤزے تنگ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات صرف عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، تو پھر مسجد ہو یا بازار، حکومت کا ایوان ہو یا تفریح کا میدان، آپ کو ہر مقام پر صرف اور صرف اسلام ہی کی پیروی کرنی پڑے گی، پھر اس طرز عمل کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں پہنچ کر تو آپ بیت اللہ کی طرف رخ کریں، اور دفتر و بازار میں پہنچ کر ماسکو اور پیکنگ کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیں، آپ کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر انسانیت کے صرف اس محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم و ابرو کو دیکھنا ہو گا جس کی تعلیمات نے صرف مسجدوں میں اجالا نہیں کیا، بلکہ اس کے نور ہدایت سے حکومت کے ایوان اور معیشت کے بازار بھی یکساں طور پر جگمگائے ہیں۔

بعض حضرات اس نعرے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں جس سوشلزم کو اپنایا گیا ہے وہ لادینی سوشلزم نہیں، بلکہ "اسلامی سوشلزم" ہے اور جس طرح "جمہوریت" اسلامی ہو سکتی ہے اسی طرح "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح بھی درست ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جہاں اصطلاح کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک نہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح درست ہے اور نہ "اسلامی سوشلزم" کی، یہ دونوں نظام مغرب کی لادینی فکر کی پیداوار ہیں۔ اور ان کے ساتھ اسلام کا پیوند لگانا ایک طرف اسلام کی توہین ہے، اور دوسری طرف اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نظام جوں کے توں اسلام کے مطابق ہیں، لہٰذا لفظوں کی حد تک تو یہ دونوں اصطلاحیں ہماری نظر میں غلط اور مغالطہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کو دونوں ہی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

لیکن معنویت کے لحاظ سے "اسلامی جمہوریت" اور "اسلامی سوشلزم" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ جمہوریت کے فلسفے میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں، (مثلاً عوام کے اقتدار اعلیٰ کا تصور، لیجسلیچر کا خدائی احکام کی پابندی کے بغیر خود

مختار واضع قانون ہونا، اور امیدوار حکومت کا از خود اقتدار کی طلب کرنا) لیکن جمہوریت کی وہ بہت سی باتیں اسلام کے مطابق بھی ہیں، جنہیں عرف عام میں جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے یعنی شورائی حکومت تقسیم اختیارات، آزادی اظہار رائے اور عوام کے سامنے حکومت کی جواب دہی وغیرہ اب جو لوگ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے مراد نظام جمہوریت کی صرف وہ باتیں ہیں جو اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ان کو نکال کر جو باقی بچتا ہے وہ "اسلامی جمہوریت" ہے انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر توحید رسالت اور آخرت پر ایمان لا کر جمہوری نظام حکومت کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے تو وہی لادینی جمہوریت اسلامی بن جاتی ہے ــــ دوسرے الفاظ میں ان کے نزدیک لادینی جمہوریت کی خرابی صرف اس قدر نہیں ہے اس کا نظریہ پیش کرنے والے مادہ پرست اور غیر مسلم تھے جنہوں نے اپنی مادہ پرستی کا جوڑ جمہوریت کے ساتھ ملا دیا تھا اور اگر توحید پر ایمان رکھنے والے لوگ اسے بعینہ اختیار کر لیں گے تو اس کی خرابی دور ہو جائے گی، بلکہ ان کے نزدیک کچھ خرابیاں خود جمہوریت میں پائی جاتی ہیں، اور ان خرابیوں کو نکال کر باقی ماندہ حصے کو وہ "اسلامی جمہوریت" قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ بلند کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سوشلزم کے معاشی نظام میں بذاتہ کوئی خرابی نہیں، اس کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والے منکر خدا تھے اور انہوں نے اس انکار خدا کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملا دیا تھا، اب اگر اسی معاشی نظام کو مسلمان اختیار کر لیں تو اس کی خرابی دور ہو جاتی ہے، گویا سوشلزم کے معاشی نظام کو جوں کا توں لے کر اس میں خدا، رسول اور آخرت کے عقائد کو شامل کر لیجئے تو وہی لادینی سوشلزم اسلامی بن جاتا ہے۔

اور اگر یہ حضرات یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم نے سوشلزم سے غیر اسلامی اجزاء کو نکال کر اس کا نام "اسلامی سوشلزم" رکھا ہے تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے، ورنہ ان کا یہ دعویٰ دو وجہ سے غلط ہے، ایک تو اس لئے کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ معاشی نظام میں سوشلزم کے معاشی نظام کی تمام وہ باتیں باقی رکھی ہیں جو صریحی طور پر خلاف اسلام ہیں، سوشلزم کی بنیاد وسائل پیداوار پر بہ جبر قبضہ کر لینے پر ہے، اور یہ بات جوں کی توں ان کے "اسلامی سوشلزم" میں بھی موجود ہے جس کی صراحت ان کے رہنما اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ کرتے رہے، دوسرے اس لئے کہ سوشلزم کا صرف مادی فلسفہ نہیں، بلکہ اس کا معاشی نظام بھی

سر سے لے کر پاؤں تک اسلام کے خلاف ہے۔ لہٰذا اگر اس میں سے غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیا جائے تو حاصل تفریق کچھ بچتا ہی نہیں ہے جسے "اسلامی سوشلزم" کہا جا سکے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح بالکل ایسی ہی ہے جیسے "اسلامی بنکاری" کی اصطلاح موجودہ بنکاری کا سارا نظام سود پر چل رہا ہے۔ اس لئے یہ نظام بلاشبہ غیر اسلامی ہے، لیکن اگر اسی نظام سے سود کی گندگی کو خارج کر کے اسے مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو یہی نظام اسلام کے مطابق ہو جائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسے نظام کا نام "اسلامی بنکاری" رکھ دے تو اس کی اس اصطلاح پر تو اعتراض کیا جا سکتا ہے، لیکن معنویت کے لحاظ سے اس کی بات غلط نہیں ہے۔

اس کے برخلاف "اسلامی سوشلزم" کی مثال ایسی ہے جیسے "اسلامی سود" اور "اسلامی قمار" .... اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ "سود" اور "قمار" کی خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے موجد اسلام کے بنیادی عقائد کے قائل نہیں تھے اب ہم ان کے نظریات میں سے تمام غیر اسلامی اشیاء کو نکال کر دیتے ہیں اور توحید، رسالت اور آخرت کو مان کر سود کھاتے اور قمار کھیلتے ہیں، لہٰذا ہمارے سود و قمار کا نام اسلامی سود و قمار ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات حد درجہ مضحکہ خیز ہوگی، اس لئے کہ سود و قمار سرتاپا خلاف اسلام چیزیں ہیں، اور ان میں سے خلاف اسلام اشیاء کو نکال دیا جائے تو کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہتی جس کا نام "اسلامی سود" یا "اسلامی قمار" رکھا جائے۔

لہٰذا اسلامی جمہوریت کی اصطلاح لفظی طور پر غلط سہی، لیکن معنی کے اعتبار سے "اسلامی سوشلزم" کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اس لئے اختیار کی ہے کہ ماضی میں بہت سے لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس اصطلاح سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حامی نہیں۔ لیکن یہ دلیل بھی انتہائی بودی اور کمزور ہے، کیونکہ ایک غلط فہمی کو رفع کر کے دوسری غلط فہمی پیدا کر دینا عقل و خرد کی کون سی منطق کا تقاضا ہو سکتا ہے؟ اگر واقعتہً مقصد یہی واضح کرنا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم وستم کا حامی نہیں تو پھر اس کے لئے "اسلامی سوشلزم" کے بجائے "اسلامی عدل عمرانی" (ISLAMIC SOCIAL JUSTICE) کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے۔

پھر اس نعرے میں اسلام اور جمہوریت کو سوشلزم کے ساتھ معصومیت سے شیرو شکر کر کے پیش کیا گیا ہے، گویا ان دونوں چیزوں کا سوشلزم کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ نہ تو کسی مرحلے پر اسلام سے میل کھاتا ہے اور نہ کسی مقام پر جمہوریت اسے چھو کر گزری ہے، اسلام بلاشبہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی منصفانہ طریقے پر تقسیم ہو اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے، لیکن اس مقصد کے لئے جو ظالمانہ طریق کار سوشلزم نے تجویز کیا ہے، اسلام اس کا بھی کسی طرح روا دار نہیں، اس لئے کہ وسائل پیداوار کو لوگوں سے چھین کر حکومت کے چند افراد کے ہاتھوں میں تھما دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ملک کی ساری دولت ایک بڑی سرمایہ دار جماعت کے حوالے ہو جائے، اور عام آدمی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ اس کے رحم و کرم کا محتاج ہو کر رہ جائے، لہٰذا انفرادی ملکیت کی جس نفی پر سوشلزم کی بنیاد ہے، اسلام چند قدم بھی اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سوشلزم کی تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت بھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی، جمہوریت کی روح "آزادیٔ اظہار رائے" پر قائم ہے۔ اور سوشلزم نظام زندگی میں یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ سوشلزم جس جگہ بھی قائم ہوا ہے، جبر و تشدد کے ذریعہ قائم ہوا ہے۔ اس نے ہمیشہ فکر و رائے کا گلا گھونٹ کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے خود پسند مزاج نے اس آواز کو کبھی گوارا نہیں کیا جو اس پر تنقید کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں جو "منصوبہ بند معیشت" قائم کی جاتی ہے وہ شدید ترین آمریت کے بغیر نہ قائم ہو سکتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے۔ یقین نہ آئے تو ان ملکوں کے حالات پڑھ کر دیکھئے جہاں سوشلزم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے، کیا وہاں اشتراکی پارٹی کے سوا کوئی اور سیاسی جماعت پنپ سکتی ہے؟ کیا وہاں مزدور کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی چھوٹی سی انجمن ہی بنا لے؟ کیا وہاں کا مزدور حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف ہڑتال کر سکتا ہے؟ کیا وہاں کے پریس کو آزادی ہے کہ وہ برسراقتدار جماعت کے خلاف چوں بھی کر سکے؟ ___ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر آخر وہ کون سی جمہوریت ہے جس کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملایا گیا ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہم جانتے ہیں کہ بہت سے وہ حضرات بھی اس نعرے کے ساتھ ہم آواز ہو گئے ہیں جو ذہنی اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں، اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی جنت ارضی بھی انہیں پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ سوشلزم کے فریب میں صرف اس لئے آگئے ہیں کہ اس "جنت شداد" پر "اسلام" کا سائن بورڈ لگا دیا گیا ہے، ایسے حضرات سے ہم خاص طور پر وردِ مندانہ التجا کرتے ہیں کہ وہ مندرجہ بالا حقائق پر غور فرمائیں اور "اسلامی سوشلزم" کی تاریخ کا مطالعہ کر کے یہ دیکھیں کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں؟ اور اسلامی اقدار کو کس طرح ایک ایک کر کے پامال کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بلاشبہ قابل نفریں ہیں، اور ہر دھڑکتے ہوئے دل میں ان کو مٹانے کا جذبہ ہونا ہی چاہئے۔ لیکن یاد رکھئے کہ غریب مزدور اور کسان کو امن و سکون صرف غریبوں کے اس چارہ ساز ــــ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کے دامن میں مل سکے گا جس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، اشتراکیت کی جھولی میں گرنے کے بعد اس کی مثال اس پرندے سے مختلف نہیں ہوگی جو کھولتی ہوئی دیگ سے اچھل کر دہکتی ہوئی آگ میں جا گرے۔

و ما علینا الا البلاغ

سوشلزم اور معاشی مساوات

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ سوشلزم میں معاشی مساوات کا لفظ کوئی عملی حقیقت نہیں رکھتا، بلکہ خالص اشتراکی ممالک کی اجرتوں میں ایک سو دس اور تیس ہزار کا تفاوت موجود رہا ہے، یعنی چوٹی کے لوگوں کی تنخواہیں عام مزدوروں کے مقابلے میں تین سو گنا سے زائد ہوتی ہیں، اگر اسی کا نام معاشی مساوات ہے تو خدا جانے طبقاتی تفاوت کیا چیز ہوتی ہے؟ اس مختصر تشریح ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم نے "معاشی مساوات" کا صرف نعرہ ہی لگایا ہے، ورنہ ٹھیٹھ اشتراکی ممالک میں بھی طبقات کا بدترین تفاوت موجود ہے۔

اس کے برخلاف اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی معاشی مساوات قائم کرنے کا جھوٹا دعویٰ نہیں کیا۔ اسلام دین فطرت ہے اور یہ فطری حقیقت اس کی نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی کہ تمام انسانوں کی آمدنی کا برابر ہو جانا قطعی ناممکن ہے، جس طرح انسانوں کے درمیان ان کی صحت، خوبصورتی، عمر، ذہانت اور قوت کارکردگی میں قدرتی فرق موجود ہے، اور اس فرق کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہو سکی جو سب انسانوں کو جسامت، قوت، وزن میں برابر کر دے۔ جب انسانی افراد میں یہ تفاوت مٹانا ممکن نہیں تو ان کی آمدنی میں تفاوت کا پایا جانا بھی قطعی ناگزیر ہے جب تک انسانوں کی ذاتی صلاحیتوں میں فرق موجود ہے، اس وقت تک ان کی آمدنی میں بھی تفاوت موجود رہے گا اور دنیا کا کوئی نظام اس تفاوت کو ختم نہیں کر سکتا۔ اور کرنا بھی نہیں چاہئے کہ وہ صریح ظلم ہو گا۔ انسان کی ظاہر نظر کسی وقت دھوکا کھا سکتی ہے، لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون تبدیل نہیں ہو سکتا۔ بعض اوقات انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک مٹی ڈھونے والے مزدور نے ایک تجربہ کار انجینئر کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت کی ہے، اس کے باوجود انجینئر نے گھنٹہ بھر معمولی محنت کر کے اتنے پیسے کما لئے جتنے مزدور نے دن بھر چلچلاتی دھوپ میں منوں مٹی ڈھو کر بھی نہیں کمائے، ہو سکتا ہے کہ کسی ظاہر بین کو یہ خیال ہو کہ مزدور کے

ساتھ انصاف نہیں ہوا. لیکن جو شخص حقیقت پسند ہو گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ انجینئر کی یہ کمائی در حقیقت صرف گھنٹہ بھر کی معمولی محنت کا معاوضہ نہیں بلکہ اس میں سالہا سال کی اس کی طویل ذہنی اور جسمانی محنت کا صلہ بھی شامل ہے جو اس نے انجینئرنگ کی تعلیم اور تجربہ حاصل کرنے میں صرف کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آمدنی کے اس فطری تفاوت کا انکار کر کے کبھی مکمل معاشی مساوات قائم کرنے کا اعلان نہیں کیا، ہاں اس فطری تفاوت کو معقول، منصفانہ اور فطری حدود میں رکھنے کے لئے ایسے اقدامات کئے ہیں جن کے ذریعہ یہ تفاوت ظالمانہ سرمایہ داری کی شکل اختیار کر کے کسی فریق پر ظلم نہ بننے پائے۔

اس ناگزیر فطری تفاوت کو معقول اور منصفانہ حدود میں رکھنے کے لئے اسلام نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ تمام اشیاء (GOODS) اور خدمات (SERVICES) آزاد مسابقت کے بازار (FREE COMPETITION MARKET) میں پہنچ کر (رسد و طلب کی فطری قوتوں کے واسطے سے) اپنی قیمت آپ متعین کریں، اور حقیقت یہ ہے کہ آمدنی کے تفاوت کو اعتدال، انصاف اور معقولیت کی حددو میں رکھنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں، کسی بھی انسان کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اشیاء اور خدمات کی سو فی صد مناسب قیمتیں مقرر کر سکے. لہٰذا جس طرح اشیاء و خدمات کی ذاتی قدروں (INTRIN SIC VALUES)اور ان کے افادہ (UTILITY) کا تفاوت فطری ہے، اور اسے جانچنے کے لئے کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے، اسی طرح ان کی بازاری قیمتوں (MARKET PRICES) کا تفاوت بھی انسان کی تعیین سے بالاتر ہے۔ صرف رسد و طلب کے فطری عوامل ہی کھلے بازار میں اس تفاوت کی شرح متعین کر سکتے ہیں۔

یہ معقول اور منصفانہ معیشت کی طبعی رفتار ہے، اور جہاں کہیں اس طبعی رفتار پر کوئی مصنوعی روک مقرر کی گئی ہے، اسی جگہ انسانوں کی آمدنی کا یہ تفاوت غیر منصفانہ اور حد سے زائد ہو گیا ہے. سرمایہ دارانہ نظام میں سود، سٹہ، اور قمار کا رواج عام بازار کی آزاد مسابقت کو ختم کر کے اس میں چند افراد کی اجارہ داریاں قائم کر دیتا ہے۔ جس میں رسد و طلب کی قوتیں عوام کے حق میں مفلوج ہو کر صرف سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہیں، اور اس طرح اشیاء اور خدمات کی قیمتیں آزادی کے ساتھ بازار میں متعین نہیں ہوتیں، بلکہ سرمایہ دار کے نہاں خانۂ دماغ میں اس منصوبہ کے تحت مقرر ہوتی ہیں جس کا تانا بانا وہ خالص اپنے ذاتی منافع سے تیار

کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کی آمدنی کا تفاوت اپنی فطری حدود میں رہنے کے بجائے اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ دولت کا سارا بہاؤ چند سرمایہ داروں کی سمت پھر جاتا ہے اور عوام کی سمت کھلنے والے دولت کے تمام وہانے خشک ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا اصل علاج یہ تھا کہ سود، سٹہ، قمار اور پرمٹ کے سسٹم کے ذریعہ جو اجارہ داریاں بازار کی آزادی کو ختم کئے ہوئے ہیں، انہیں توڑ کر آزاد مسابقت کی فضا پیدا کی جائے جس میں رسد و طلب کی قوتیں اپنا پورا عمل دکھا کر قیمتوں کے نظام کو معتدل طریقے سے استوار رکھ سکیں۔ لیکن سوشلزم نے اس حقیقی علاج کے بجائے ایک دوسرا مصنوعی نظام مقرر کر دیا جس میں حکومت نے رسد و طلب کی فطری قوتوں کی جگہ لے کر پوی معیشت کو حکومتی پارٹی کی منصوبہ بندی کے تابع بنا دیا، اور قیمتوں اور اجرتوں کا نظام بھی اسی کے حوالے کر دیا۔

شروع میں یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ آمدنی کے تفاوت کو بالکل ختم کر دیا جائے، اس بات کے اعلانات بھی کئے گئے کہ آمدنی میں اب مکمل مساوات قائم کر دی جائے گی، لیکن آمدنی کا جس قدر تفاوت فطرت کا تقاضا تھا، جب اسے ختم کرنے پر قدرت نہ ہوئی تو "معقول تفاوت" کو بطور ایک اصول کے تسلیم کر لیا گیا، اور کہا گیا کہ مارکسزم مساوات پرستی کا دشمن ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس اصول کے عملی اطلاق کے لئے انسانوں کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں تھا جو معقول اور غیر معقول، ضروری اور غیر ضروری، منصفانہ اور غیر منصفانہ تفاوت کے درمیان واضح حد بندی کر سکے، رسد و طلب کی آزاد فطری قوتیں جو یہ حد بندی کر سکتی تھیں، انہیں پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری منصوبہ بندی کا وہ مصنوعی نظام جو بڑے بڑے افسروں کی ذاتی خواہشات یا ان کے مختلف نظریات کے مطابق لچکنے اور لچکتے رہنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، ان فطری قوتوں کی جگہ نہ لے سکا جو ان کی دسترس سے ماورا ہیں۔ اس لئے اس تفاوت کی تعیین میں افراط و تفریط ہوتی رہی۔ جب تفاوت کا دروازہ ایک مرتبہ کھلا تو کھلتا چلا گیا، جس دلیل سے پانچ اور دس کا فرق معقول قرار پایا تھا، اس دلیل کو آگے بڑھا کر پانچ اور پندرہ کا تفاوت بھی منصفانہ قرار دے دیا گیا، اور یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ اشتراکی ممالک میں بھی آمدنی کا فرق ٹھیک اس سطح تک پہنچ گیا جو سرمایہ دارانہ نظام میں قائم ہوئی تھی۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں نے فطرت سے بغاوت کر کے معیشت کے پورے ڈھانچے کو مصنوعی طور سے کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے اعتدال اور توازن دونوں میں سے کہیں قائم نہیں رہ سکا، اشتراکیت خواہ کتنے صدق

دل سے امارت و غربت کی اونچ نیچ ختم کرنے کے لئے چلی ہو، فطرت سے منہ موڑنے کے بعد بالآخر وہ بھی طبقاتی تفاوت کے اس مقام پر پہنچ گئی جہاں سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اقبال مرحوم نے غالبًا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔

وست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مرد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

اسلام نے چوں کہ قیمتوں اور اجرتوں کے نظام کو مصنوعی قیود سے آزاد رکھ کر اسے رسد و طلب کے فطری بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے، اس لئے اس نے کبھی اشتراکیت کی طرح معاشی مساوات کا جھوٹا دعویٰ تو نہیں کیا، لیکن آمدنی کے تفاوت کو کچھ اس طرح انصاف اور اعتدال کی حدود میں رکھا ہے کہ دولت خود بخود معاشرے میں ایک معقول توازن کے ساتھ گردش کرتی ہے، اور امیر و غریب کا وہ حد سے بڑھا ہوا فرق پیدا نہیں ہو پاتا جو سرمایہ دارانہ نظام، اور بالآخر اشتراکیت میں بھی لازمًا پیدا ہو کر رہتا ہے۔

ہم نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اسلام نے کبھی معاشی مساوات قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، اس پر شاید ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم ہمیشہ سے اسلام کی ایک لازمی خصوصیت مساوات سنتے آئے ہیں، "اسلامی مساوات" کا لفظ مسلمانوں نے ہمیشہ فخر کے ساتھ استعمال کیا ہے، اور ہر کس و ناکس یہ سمجھتا اور جانتا ہے کہ اسلام مساوات کا حامی ہے، اگر اسلام نے معاشی مساوات کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر ان تمام باتوں کا کیا مطلب ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اسلام جس مساوات کا علمبردار ہے وہ ٹھیٹھ معنی میں معاشی مساوات نہیں، بلکہ معاشرتی مساوات ہے۔ "اسلامی مساوات" کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں تمام مسلمان اپنے معاشرتی اور تمدنی حقوق میں بالکل برابر ہیں، کسی کو کسی پر اپنی قومیت، اپنی نسل، اپنے مال و جاہ یا اپنے عہدہ و منصب کی وجہ سے کوئی فوقیت حاصل نہیں، اسلام میں یہ بات گوارا نہیں کی جا سکتی کہ حکومت کا کوئی فرد محض اپنے بلند منصب کی وجہ سے قانون کی کسی گرفت سے آزاد ہو جائے. یا ایک مال دار شخص محض انکم ٹیکس ادا کرنے کی بناء پر کچھ ایسے معاشرتی اور تمدنی حقوق حاصل کر لے جو ایک غریب شخص کو محض غریبی کے جرم میں حاصل نہیں ہیں۔

اس معاشرتی مساوات کا لازمی اثر معیشت پر بھی پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے معیشت میں یہ مساوات ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ہر شخص کو کسب معاش کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں، کوئی شخص دولت کا اجارہ دار بن کر دوسروں کے لئے عملاً کمائی کے راستے بند کرنے کا مجاز نہیں ہے ہاں ان یکساں مواقع سے جائز طور پر فائدہ اٹھا کر کوئی شخص اپنی ذہانت اور صلاحیت کے سبب دوسروں سے زائد کما لیتا ہے تو اسلام کی نظر میں وہ ہرگز مجرم نہیں ہے، اس کی آمدنی حلال طیب ہے، اور اسلام اس کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے۔ اگر اس طریقے سے لوگوں کی آمدنی میں فرق پیدا ہو تو وہ ہرگز اسلام کے خلاف نہیں ہے، یہ فرق فطرت کے عین مطابق ہے، خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ فرق موجود تھا، اور صحابہ کرامؓ کے ہر دور میں موجود رہا، اور تاریخ اسلام کے چودہ سو سالوں میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں یہ تفاوت موجود نہ رہا ہو البتہ اس تفاوت نے کبھی امیر و غریب کے معاشرتی اور تمدنی حقوق میں فرق پیدا نہیں کیا، جو حقوق عثمان غنیؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور زبیر بن عوامؓ، جیسے صحابہؓ کو حاصل تھے وہی حقوق ابوہریرہؓ، سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ کو بھی حاصل تھے، بلکہ بعض غریب حضرات اپنے علم و تقویٰ کی بنیاد پر عزت و شرف کے اعتبار سے مالدار حضرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز ہوتے رہے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ سوشلزم کی تائید میں بار بار "اسلامی مساوات" کو بیچ میں لاتے ہیں، وہ ایک بڑے بھاری خلط مبحث کا ارتکاب کرتے ہیں، سوشلزم جس معاشی مساوات کو اپنی منزل قرار دیتا ہے (لیکن نہ کبھی اس منزل تک پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے) اسلام نے اسے قائم کرنے کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا۔ اس کی مساوات معاشرتی مساوات ہے جسے کسی بھی طرح سوشلزم کی تائید میں پیش نہیں کیا جا سکتا ——

سوشلسٹ اعتراضات

سوشلزم کے بارے میں ہم بار بار اپنے موقف کااظہار کر چکے ہیں، ہمارے نزدیک، اور صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں، اس ملک کے دس کروڑ مسلمانوں کے نزدیک پاکستان میں اسلام کے سوا کوئی نعرہ، کوئی نظریہ اور کوئی نظام قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی بنیاد ہی صرف اسلام کے نام پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا یہاں امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کو گوارا کیا جا سکتا ہے، اور نہ روس اور چین کے اشتراکی نظام کو۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس ملک کے عوام کی اکثریت یہاں اسی اسلام کو روبہ عمل دیکھنا چاہتی ہے جو سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔ اس لئے اگر اس ملک میں اسلام کے علی الرغم اشتراکیت، سوشلزم یا کمیونزم کے نعرے لگتے ہیں تو یہاں کے ہر باشندے کا فطری حق ہے کہ وہ ان نعروں کے خلاف آواز اٹھائے۔ اور ہر اس تحریک کی مذمت کرے جو یہاں کسی غیر اسلامی نظریہ کو پروان چڑھانا چاہتی ہو۔

ہم نے اشراکیت کے خلاف لکھ کر اپنے اسی فطری حق کو استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری یہ تحریریں ان حضرات کو پسند نہ آسکیں جو اشتراکیت کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حامی ہیں، اور اسی نظام کو یہاں قائم کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

ہماری ان تحریروں پر مختلف قسم کے اعتراضات کئے گئے ہیں، ان اعتراضات میں سے بعض تو وہ مخصوص سکہ بند اعتراضات ہیں جو ساری دنیا کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اپنے مخالفین کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو علمی نوعیت کے ہیں اور انہیں پیش کرنے کا منشاء افہام و تفہیم ہے، ضد، عناد اور پروپیگنڈہ نہیں۔ ہم دوسری قسم کے اعتراضات کی بطور خاص قدر کرتے ہیں، اس قسم کے جتنے اعتراضات اور شبہات ہم تک پہنچے ہیں، ان کا حل ان صفحات پر پیش کر رہے ہیں۔ اور دوسرے حضرات کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان کے ذہن میں اس موضوع سے متعلق کچھ اشکالات ہیں تو وہ پوری آزادی کے

ساتھ ہمیں ان کی طرف متوجہ کریں۔ انشاء اللہ ہم پورے خلوص کے ساتھ ان کا جواب پیش کریں گے۔

رہے پہلی قسم کے اعتراضات، سو دراصل ان کا منشا سرے سے سمجھنا سمجھانا ہے ہی نہیں، وہ تو چند چلتے ہوئے جملے ہیں جنہیں پروپیگنڈے کی مشینریوں نے خاص اہتمام کے ساتھ گھڑا ہے، اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انہیں نعرہ بازی کے لئے موقع بے موقع استعمال کیا جا رہا ہے، لہٰذا ان کا کوئی تحقیقی جواب دینا تو اس لحاظ سے بالکل فضول ہے کہ ان کے گھڑنے والوں نے انہیں تحقیق کے لئے گھڑا ہی نہیں ہے ان کا مقصد تو صرف اپنے مخالفوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص ہزار ان کا جواب دیتا رہے مگر پروپیگنڈے کا یہ راگ بند نہیں ہو سکتا۔

البتہ جن سادہ لوح عوام کو اس پروپیگنڈے سے مرعوب اور متاثر کیا جا رہا ہے۔ انہیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لئے ان نعروں کی اصلیت بیان کرنا ضروری ہے، اس لئے ہم یہاں پہلے اسی قسم کے اعتراضات پر مختصر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ہم پر سب سے پہلا اعتراض تو اشتراکیت کی ٹکسالی زبان میں یہ کیا گیا ہے کہ ہم "سرمایہ داروں کے ایجنٹ" ہیں، اور مزدوروں کی تحریک کے مقابلے میں سرمایہ داری کی حمایت کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس اعتراض کا نشانہ صرف ہم کو نہیں، ہر اس شخص کو بننا پڑتا ہے جو اشتراکیت کے خلاف زبان کھولے۔ اسی وجہ سے اشتراکی عناصر سارے علمائے دین کو یہ ہی طعنہ دیتے رہتے ہیں کہ یہ لوگ محنت کشوں کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

لیکن جس شخص کے دل میں عدل و انصاف کی ادنیٰ رمق موجود ہو، وہ اس سفید جھوٹ کو سچ سمجھنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ اگر سرمایہ داروں کی حمایت سے ان کی مراد اس سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت ہے جو مغربی سامراج نے ہم پر مسلط کیا تھا اور جس نے غریب عوام کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر صرف چند افراد کی پرورش کی ہے، تو کسی ایک عالم دین کا نام نہیں بتایا جا سکتا جس نے اس جابرانہ نظام معیشت کی حمایت کی ہو۔ اس کے برخلاف ہندوستان کی دو سو سالہ تاریخ میں اس سامراجی نظام کے خلاف سب سے پہلے بغاوت کا علم

اٹھانے والا اگر کوئی گروہ تھا تو وہ انہی علمائے حق کا مقدس طائفہ تھا جنہوں نے ہندوستان پر سے مغرب کے سیاسی اور فکری تسلط کو زائل کرنے کے لئے اپنی جان، اپنا مال، اپنی آبرو اپنے شخصی جذبات، اپنے مفادات اور اپنے اوقات کی بیش بہا قربانیاں پیش کی ہیں اور کون ہے جو اس معاملے میں ان سے زیادہ قربانیاں دینے کا دعویٰ کر سکے؟

ہاں یہ درست ہے کہ علماء حق نے سرمایہ دارانہ نظام کو صرف زبان سے گالیاں دینے اور اس پر چند مبہم اعتراضات کرنے کے بجائے خرابی کی اس جڑ کو پکڑا جس کے زور سے سرمایہ داری کا شجرۂ خبیثہ تناور ہوتا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ساری خرابیوں کی بنیاد سود، قمار، سٹہ اور اکتناز ہے۔ یہی وہ راستے ہیں جن کے ذریعہ سرمایہ دار کے پاس دولت کے تالاب بہتے رہتے ہیں اور غریب انسان اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکتا، چنانچہ قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک تمام علماء متفقہ طور پر اپنی توانائیاں اس پر صرف کرتے رہے ہیں کہ کسی طرح اس ملک سے سرمایہ دارانہ نظام کی یہ لعنتیں ختم ہوں اور ان کی جگہ اسلام کا متوازن نظام معیشت نافذ ہو جائے۔ ان کوششوں کے صلے میں انہیں "تنگ نظری" کے بھی طعنے دیئے گئے "رجعت پسند" اور "دقیانوسی" بھی کہا گیا، لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، یہ اوچھے ہتھیار انہیں اس کے اظہار سے نہ روک سکے۔ جو لوگ آج بڑے زور شور کے ساتھ سرمایہ داری سے نفرت اور غریبوں سے ہمدردی کے دعوے کر رہے ہیں، اس وقت غریبوں کی بے کسی نے ان کے دل میں کوئی درد پیدا نہیں کیا، اس وقت یہی لوگ تھے جنہوں نے راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو سہارا دیا تھا۔ انہوں نے ہی اس ملک میں سود، قمار اور سٹہ کی پشت پناہی کی، اور جو علماء غریبوں کو اس ظلم و ستم سے نجات دلانا چاہتے تھے، انہیں "تنگ نظر" اور "رجعت پسند" قرار دے کر مطعون کیا۔

لیکن یہ عجیب و غریب منطق ہے کہ جن لوگوں نے سودی نظام معیشت کو ملک پر مسلط رکھنے کی کوشش کی، وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ نہ ہوئے، جنہوں نے پاکستان سے قمار، انشورنس اور لائسنس پرمٹ کے مروجہ طریقے ختم کرنے کی مخالفت کی، وہ سرمایہ داری کے حامی ہو گئے، جنہوں نے ساری عمر زمینوں کے سودی رہن اور سودی قرضوں کی وکالت کی وہ جاگیرداری کے محافظ نہ کہلائے، جنہوں نے پورے ملک کی معیشت کو سٹہ بازوں کے رحم و کرم پر چھوڑے رکھا، وہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کے مجرم نہ ہوئے، جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام

کے سب سے بڑے مخالف ـــــ اسلامی نظام معیشت ـــــ کا ہر طرح راستہ روکا، ان پر سرمایہ داری کی حمایت کا الزام نہ لگا ـــــ اور وہ علماء جو روز اول سے ان تمام لعنتوں کے مقابلے میں سینہ سپر رہے اور جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر یہاں اسلام کا عادلانہ نظام لانے کی کوشش کی وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ قرار پا گئے ـــــ صرف اس لئے کہ وہ سرمایہ داری کے ظلم و ستم کے بدلے اشتراکیت کا جبرو استبداد پسند نہیں کرتے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و ستم کا تعلق ہے، علمائے دین سے زیادہ اس کی مخالفت کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ علماء کی تحریر و تقریر، ان کے بیانات اور ان کی پیہم عملی کوششیں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس قارونی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، اب بھی وہ اس کے زبردست مخالف ہیں، اور آئندہ بھی مخالف رہیں گے، لیکن ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام زندگی کو بہ تمام و کمال نافذ کر دیا جائے، کیوں کہ سرمایہ دارانہ ظلم و جور کا جتنا منصفانہ حل اسلام کے پاس ہے، دنیا کے کسی نظام کے پاس نہیں ہے۔

خاص طور سے سوشلزم نے سرمایہ داری کی مخالفت کا جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ ہمارے نزدیک نہایت مضر، بےحد خطرناک اور انتہائی تباہ کن ہے، سوشلزم بھی اسی مغربی مادیت کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کا عذاب دنیا پر مسلط کیا تھا، اور اس کا مطلب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ کروڑوں عوام کی تقدیر چند سرکاری افسروں کے ہاتھ میں تھما دی جائے جو عوام کے صرف روپے پیسے پر ہی نہیں، بلکہ ان کے دل و دماغ پر ان کے ضمیر ادر زبان پر اور ان کے جذبات و خواہشات پر پورے جبر و استبداد کے ساتھ حکمرانی کریں، انہیں سر سے لے کر پاؤں تک اپنے مفادات کا غلام بنا کر ان سے مشین کے بے جان کل پرزوں کی طرح کام لیں۔ اور انہیں اشتراکی آمریت کے اس ہولناک شکنجے میں کس ڈالیں جو انسان سے اس کے قلب و روح کا ہر اختیار سلب کر لینے کے بعد اس سے فریاد کرنے والی زبان بھی چھین لیتا ہے۔

سوشلزم کا یہ سراسر غیر انسانی نظام زندگی درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام ہی کی ایک بدترین صورت ہے۔ جس میں ایک بڑا سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو ہضم کر کے غریب عوام کے لئے زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور کمیونزم کے اس انسان کش نظام کا

بھی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ہماری کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ ایک ظلم دفع ہونے کے بعد اس سے بدترین ظلم و جور ہم پر مسلط ہو جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اشتراکیت کی اس مخالفت کا نام سرمایہ داری کی حمایت رکھتا ہے، اور جو لوگ اس اشتراکی عذاب کو اپنے سروں پر مسلّط نہیں کرنا چاہتے، انہیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہتا ہے تو ہزار مرتبہ کہا کرے۔ جس طرح "تنگ نظری" اور "دقیانوسیت" کے طعنے ہمیں سرمایہ داری کی مخالفت سے نہیں روک سکتے، اسی طرح ہم ان جھوٹے طعنوں سے ڈر کر آج بھی اظہار حق سے باز نہیں رہ سکتے، ہم ہلاکت اور تباہی کا وہ مہیب غار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جس کی طرف ہمارے سادہ لوح عوام کو مکر و فریب سے دھکیلا جا رہا ہے، ہم ان خوش نما جالوں کی حقیقت سے بھی واقف ہیں۔ جو مزدوروں، اور کسانوں کو اشتراکی آمریت کے شکنجے میں کسنے کے لئے ان پر ڈالے جا رہے ہیں، ہم "مساوات" "مزدوروں کی فلاح" اور "خوش حالی" کے ان پرفریب نعروں سے بھی بخوبی باخبر ہیں جو اس ملک میں بڑے بڑے زمینداروں کی طرف سے بڑے زور و شور کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں، لہٰذا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ عوام کو اشتراکیت کے اس فتنے سے آگاہ کریں اور کوئی طعنہ، کوئی نعرہ اور کوئی الزام ہمیں اس فریضے کی ادائیگی سے نہیں روک سکتا۔ اشتراکیت کے پرستار ہمارے لئے اس طرح کے ہزار الزامات اور تراش لیں، جب تک ہماری زبان میں گویائی کی طاقت اور ہمارے قلم میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، انشاء اللہ ہم اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے رہیں گے کہ سرمایہ داری سے نجات کا راستہ اشتراکیت میں نہیں، اسلام میں ہے۔

ایک اور عجیب و غریب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سوشلزم کی مخالفت سے روس، چین اور دوسرے اشتراکی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پر برا اثر پڑے گا، چین نے ستمبر ۶۵ء کے جہاد میں ہماری جو مدد کی تھی، اس کا تقاضا ہے کہ ہم اشتراکی نظریات کو برا بھلا نہ کہیں۔

لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو سیاسی دوستی اور ذہنی غلامی کو ہم معنی سمجھتا ہو، اشتراکی ممالک کے ساتھ دوستی اور پرامن تعلقات قائم کرنا ہماری نظر میں مستحسن ہے لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے کہ ہم اپنے قلب، اپنے دماغ، اپنی فکر اور اپنے ایمان کی ساری متاع اشتراکیت

کے حوالے کر دیں، اور اگر کوئی شخص ہمارے ملک میں سوشلزم کا سراسر غیر اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے "اسلام مردہ باد" کے نعرے لگائے تو ہم اس کی زبان کو لگام دینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں۔

دنیا کا ہر ملک تعلقات خارجہ کی سطح پر مختلف ملکوں کے ساتھ تجارتی، سیاسی اور فوجی روابط قائم رکھتا ہے اور علمی سطح پر ایک دوسرے کے عقائد و نظریات پر تنقید بھی ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے لیکن یہ نرالا قانون ہم نے کہیں نہیں سنا کہ جس ملک کے ساتھ اس قسم کے روابط قائم کئے گئے ہوں، اس کے نظریات کو بھی نہ صرف درست ماننا ضروری ہے بلکہ ان نظریات کو اپنے ملک کا دستور و قانون بھی بنا لینا چاہئے اور اگر کوئی شخص ہمارے ملک میں ان نظریات کی تبلیغ کرے یا انہیں نافذ کرنا چاہے تو اس کی تردید بھی نہیں کی جا سکتی۔

اور اگر کوئی روس یا چین میں اشتراکیت کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے تو کیا یہ ممالک پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک سے دوستی کی بناء پر خاموش بیٹھے رہیں گے؟ کیا اب بھی وہاں پر اسلامی عقائد و افکار پر تنقید نہیں کی جاتی؟ کیا وہ اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے بعد اسلام کو اپنا لینے کے قائل ہو گئے ہیں، اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو آخر ہم ہی اتنے بے ضمیر کیوں ہیں کہ اشتراکی ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے بعد ہم اپنے نظریات کا دفاع کرنے کے ہر حق سے دست بردار ہو گئے ہیں؟

اگر کوئی شخص ہمیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ اشتراکی ممالک سے دوستی کے بعد ان کو تمہارے نظریات اپنانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن تم ان کے نظریات اپنانے پر مجبور ہو تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اشتراکی ممالک مادی اعتبار سے طاقت ور ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں کمزور، تو غالباً اشتراکیت کا فلسفہ یہی کچھ سکھاتا ہے کہ ہر کمزور کو صرف اپنا ظاہری ڈھانچہ ہی نہیں، اپنے عقائد و افکار اور اپنے قلب و ضمیر بھی طاقت ور کے قدموں پر نچھاور کر دینے چاہئیں۔

"زرعی اصلاحات"

آج کل حکومت کے جس کارنامے کو سب سے زیادہ قابل فخر قرار دیا جارہا ہے وہ "زرعی اصلاحات" کا اقدام ہے جس کی رو سے زمین کی ملکیت کی حد ڈیڑھ سو ایکڑ مقرر کر دی گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس اقدام کے ذریعہ ہمارے زراعتی نظام سے انصافیوں کا خاتمہ ہو جائے گا؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر یہ کیسے فرض کر لیا گیا ہے کہ جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہو گی وہ یقیناً جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو گی، اور وہ اپنے کاشتکاروں پر کوئی ظلم نہیں کرے گا اور جس شخص کی زمین ڈیڑھ سو ایکڑ سے ایک ایکڑ بھی زائد ہے اس کی ملکیت بھی ناجائز ہے وہ اپنے مزارعین پر ظلم بھی ضرور توڑتا ہو گا، اور یہ ایک ایکڑ زمین وہ واپس کر دے تو سارا ظلم ختم ہو جائے گا؟ ہمارے زرعی نظام کا اصل مسئلہ زمینداروں کا وہ ظلم ستم ہے جو وہ اپنے کاشتکاروں پر توڑتے ہیں اور جس کی وجہ سے مزارعین کی حیثیت ان کے غلاموں کی سی ہو گئی ہے اس .... ظلم و ستم کو روکنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی رو سے کرنے کا کام یہ تھا کہ ڈیڑھ سو کی حد بندی کے بجائے تمام وہ زمینیں مستحقین کو دی جاتیں جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں، جن میں سالہا سال سے میراث جاری نہیں ہوئی، یا جو داخلی رہن کے ذریعہ غریب زمین والوں سے چھین کر بڑے زمینداروں نے اپنی ملکیت میں داخل کر لی ہیں، نیز بٹائی کی منصفانہ شرح مقرر کی جاتی اور ان تمام ناجائز شرائط کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جاتا جو زمینداروں نے اپنے کاشتکاروں پر قولی یا عملی طور سے عائد کر رکھی ہیں اور جن کی وجہ سے کاشتکار غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضروری تھا کہ آڑھتیوں کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کا مناسب صلہ پانے کے مواقع فراہم کئے جاتے۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے زرعی نظام کی خرابیاں اتنی پیچ در پیچ ہیں کہ اسلامی احکام کو نظر انداز

کر کے ڈیڑھ سو ایکڑ کی حد بندی کر دینے سے ان کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت تحدید ملکیت ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہمارے زرعی نظام کے اصل مسائل حل ہو ہی نہیں سکتے، اس میں فریب کاروں کے لئے چور دروازے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ۵۹ء میں جو تحدید کی گئی اس میں بھی یہی تجربہ ہوا، اور حالیہ تحدید کے نتائج بھی اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کہ حالیہ زرعی اصلاحات میں تمام زمینداروں کو پندرہ ہزار یونٹوں کی اور جنھوں نے دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے ٹیوب ویل یا ٹریکٹر خرید رکھے ہوں ان کو مزید تین ہزار یونٹوں کی (گویا مجموعی طور سے اٹھارہ ہزار یونٹوں کی) جو چھوٹ دی گئی ہے اس کی موجودگی میں یہ تحدید عملاً بے معنی ہو کر رہ جائے گی، اس کے علاوہ تحدید بھی خاندان کے بجائے افراد کی بنیاد پر کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی بنیاد پر تحدید عملاً بے حد دشوار بھی ہے اس لئے یہ بڑے بڑے زمینداروں کے لئے تحدید کی زد سے بچنے کا ایک مخفی دروازہ ہے۔ اس طرح بڑے بڑے زمیندار اب بھی عملی طور پر ہزاروں ایکڑ زمین پر متصرف رہیں گے۔

اور اگر بالفرض کسی شخص کے پاس صرف ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہی رہے تو کیا وہ بٹائی کے معاملہ میں اپنے کاشتکاروں پر ظلم نہیں کر سکے گا؟ یہ عجیب و غریب فلسفہ ہے کہ کوئی شخص ایک سو اکیاون ایکڑ کا مالک ہے تو وہ ظالم و غاصب ہے، اور کسی کے پاس ایک سو پچاس ایکڑ ہیں تو وہ ظلم و غصب کے ہر الزام سے بری ہے۔

اسلام نے اسی وجہ سے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے ملکیت کی کوئی حد مقرر کرنے کے بجائے اپنے احکام کا مدار جائز و ناجائز اور حلال و حرام پر رکھا ہے اور عدل و انصاف کو سہل الحصول اور داد رسی کو مفت بنانے کا اہتمام کیا ہے، اور درحقیت اس قسم کے مظالم کے انسداد کا یہی واحد راستہ ہے۔ کسی کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی ہے تو وہ اس سے چھین لی جائے گی، اور اگر کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ ہیں اور وہ سب جائز طریقے سے حاصل کئے گئے ہیں، تو اس کے حق ملکیت کا پورا احترام کیا جائے گا۔ اسی طرح زمیندار اور کاشتکار کے تعلقات میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ زمیندار نے کاشتکار پر قولی یا عملی طور سے ایسی ناجائز شرائط تو عائد نہیں کر رکھیں جن کی وجہ سے کاشتکار ایک مساوی حیثیت کا فریق معاملہ ہونے کے بجائے زمیندار کا مجبور و مقہور غلام بن گیا ہو۔ اگر کسی زمیندار نے کاشتکار کو اس کے پورے حقوق دے کر اسے اپنے برابر ایک فریق معاملہ کی حیثیت دی ہے اور اس کے

ساتھ کوئی ظلم یا غصب کا برتاؤ نہیں کیا تو وہ اسلام کی گرفت سے آزاد ہے، خواہ اس کی جائز ملکیت میں کتنی زمین ہو اور اگر کسی زمیندار نے اپنے کاشتکاروں کو غلام بنایا ہوا ہے، ان کے انسانی حقوق دبا رکھے ہیں یا وہ ان کو محنت کا مناسب صلہ نہیں دیتا تو وہ اسلام کی نظر میں قابل گرفت ہے خواہ اس کی مملوکہ زمین ڈیڑھ سو ایکڑ یا اس سے بھی کم ہو۔ لہٰذا کاشتکاروں کے حقوق کی رعایت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل نہ کیا جائے۔

(۱) ملکیت کی تحدید کے بغیر جتنی زمینیں ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں وہ واپس لے کر یا اصل مستحقین کو دلائی جائیں یا اگر ان کے اصل مالک معلوم نہ ہوں تو حکومت انھیں اپنی تحویل میں لے کر بے زمین افراد میں تقسیم کرے۔

(۲) اسلام کے قانون وراثت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرایا جائے۔ اور احیاء موات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں۔

(۳) جو زمینیں داخلی رہن کے ذریعہ زمینداروں نے ہتھیا رکھی ہیں وہ قرض داروں کو واپس کی جائیں۔

(۴) بٹائی کی ایسی شرح معین کی جائے جو رفتہ رفتہ ارتکاز دولت کو ختم کر کے تقسیم دولت کے نظام کو متوازن بنا سکے۔

(۵) بٹائی کے معاملہ سے زمینداروں کی ناجائز شرائط کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ایسے انتظامات کئے جائیں جن سے کاشتکار ایک مساوی حیثیت کے فریق معاملہ کی حیثیت سے زندگی گزار سکے۔

(۶) آڑھتیوں اور دلالوں کے واسطے ختم یا کم کر کے ایسا انتظام کیا جائے کہ کاشتکار اپنی پیداوار کو کسی دباؤ کے بغیر مناسب قیمت پر فروخت کر سکیں۔

(۷) ایسے غیر سودی زرعی بینک قائم کئے جائیں جن سے کاشتکاروں کو بلاسودی قرضے اور آسان اقساط پر زرعی آلات مہیا ہو سکیں۔

(۸) پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ زرعی عدالتوں کے نظام کو سہل الحصول اور مستحکم بنایا جائے، آج مظلوموں کی مشکلات کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انصاف کا حصول اس کی دسترس سے بالکل باہر ہے، ان کے لئے ظلم پر صبر کر لینا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ سالہا سال عدالت کے چکر کاٹتے پھریں، اور

اس میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کریں، خصوصاً جب کہ مقابلے پر کوئی بڑا زمیندار یا سرمایہ دار ہو تو ایک مظلوم عدالت، تک پہنچنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ اگر انصاف کے حصول میں یہ ناقابل برداشت دشواریاں بدستور برقرار رہیں تو بہتر سے بہتر قانونی نظام بھی مظلوموں کی داد رسی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ان مجمل اشاروں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ہمارے زرعی نظام میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ تحدید ملکیت کے اقدام سے دور نہیں ہو سکتیں، اگر انہیں فی الواقع دور کرنا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے مختلف سمتوں میں محنت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنا ہو گا، اور اس غرض کے لئے ملک کے اہل علم و فکر، ماہرین قانون اور زراعت کا عملی تجربہ رکھنے والوں کی مشترک مساعی کی ضرورت ہو گی۔

صدر بھٹو نے زرعی اصلاحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"ملکیت کی تحدید خاندان کی بنیاد پر کی جائے یا افراد کی بنیاد پر؟ اس مسئلہ کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ یہ مسئلہ چونکہ اسلامی فقہ سے متعلق تھا اس لئے ہم نے معروف مسلمان محققین اور قانون دانوں سے رہنمائی اور مشورہ طلب کیا۔ اس سے جو مسلمہ نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اسلام فرد کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے، اور خاندانی ملکیت کے نظام کو تسلیم نہیں کرتا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کسی ایسی اسکیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رجحانات کے خلاف ہو، لہٰذا اسلامی احکام کی پیروی کرتے ہوئے یہ تحدید افراد کی بنیاد پر کی گئی، نہ کہ خاندان کی بنیاد پر"

(صدر کی نشری تقریر کا متن، ماخوذ از روزنامہ ڈان کراچی ۳ مارچ ۱۹۷۲ء)

اس فقرے میں صدر کی یہ بات انتہائی قابل قدر ہے کہ: "ہم کسی ایسی اسکیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رجحانات کے خلاف ہو۔" لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کون سے مسلمان محققین تھے جنھوں نے زرعی اصلاحات کے مسئلہ میں اسلام کا مکمل موقف واضح کرنے کے بجائے صرف اس چیز کو اسلام کے سر بھیڑ دیا ہے جو زمینداروں کے لئے تحدید کی زد سے بچ نکلنے کا چور دروازہ بن سکتی ہے؟

سود اور بینکنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکر و فکر

سوال نامہ ربا کا جواب

منجانب: مفتی محمد شفیع

حال ہی میں اسلامی نظریاتی کونسل نے ربا کے بارے میں ایک سوالنامہ جاری کیا تھا اس کا جو جواب حضرات مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ظلہم کی طرف سے روانہ کیا گیا ہے۔ اس مرتبہ اداریہ میں پیش خدمت ہے۔

سوال ا۔ (الف) قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں ربا کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور قبل از اسلام اس سے کیا مراد لی جاتی تھی؟ تخصیصا کیا ربا سے مراد ایسا سود ہے جو اصل زر کو دوگنا اور سہ گنا (اضعافا مضاعفۃ) کر دیتا ہے یا اس میں قرض خواہ کی طرف سے وصول کیا جانے والا رائج الوقت سود مفرد اور سود مرکب شامل ہے؟

جواب ا۔ (الف) قرآن کریم نے جس "ربا" کو حرام قرار دیا ہے اس کے مفہوم میں کوئی گنجلک یا اشتباہ نہیں۔ قرآن کریم، سنت نبویہ، آثار صحابہ اور اجماع امت نے قرض پر طے کر کے لی جانے والی ہر زیادتی کو "ربا" قرار دیا ہے خواہ وہ سود مفرد ہو یا مرکب۔ اس سلسلہ میں دلائل کی تفصیل پیش کی جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے اور بہت سے حضرات نے اس پر مبسوط مقالات اور کتابیں لکھی ہیں۔ احقر نے بھی اپنے ایک رسالے "مسئلہ سود" میں اس حقیقت کو دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ رسالہ سوالنامہ کے جواب کے ساتھ منسلک ہے، تاکہ تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ تاہم یہاں چند اہم نکات کی طرف اشارہ مناسب ہو گا۔

(۱)۔ قرآن کریم نے "ربا" کی حرمت کے تفصیلی احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

یا ایہا الذین اٰمنو اتقواللہ وذروا ما بقی من الربوآ ان کنتم مومنین (البقرہ ۲۷۸)

اے ایمان والوں اللہ سے ڈرو، اور ربوا کی جو کچھ رقم باقی ہو اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اس میں "مابقی من الربوا" (ربا کی جو کچھ رقم باقی ہو) کے الفاظ عام اور سود کی ہر مقدار کو شامل ہیں، آگے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ارشاد ہے و ان تبتم فلکم رء وس اموالکم لا تظلمون و لا تظلمون اور اگر تم (ربا سے) توبہ کرو تو تمہارے راس المال تمہیں مل جاویں گے۔ (اس طرح) نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر کسی طرف سے ظلم ہو گا۔ اس آیت نے واضح طور سے بتا دیا ہے کہ "ربا" سے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ راس المال (اصل زر) کے سوا کسی چیز کا مطالبہ نہ کرے، اور لا تظلمون و لا تظلمون سے اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اصل رقم پر ہر اضافہ خواہ کتنا کم کیوں نہ ہو، ظلم میں داخل ہے۔ رہا قرآن کریم کا ارشاد کہ لاتاکلوا الربوآ اضعا فامضاعفۃ (سود کو چند در چند کر کے مت کھاؤ۔ ۳۔ ۱۳۰) سو اس میں "چند در چند" کا لفظ حرمت سود کی قانونی شرط نہیں ہے، بلکہ اس جرم کی صرف ایک قبیح ترین صورت پر تنبیہ ہے۔ے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ارشاد ہے لا تشتروا با یاتی ثمناً قلیلاً (البقرہ ۱ ٤) یعنی میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر فروخت نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ یہاں "تھوڑی سی قیمت" ممانعت کی قانونی شرط نہیں ہے چنانچہ کوئی معقول آدمی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ آیات الٰہی کو بڑی قیمت کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔ اس کے بجائے یہ الفاظ محض جرم کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ بعینہ یہی معاملہ "اضعافا مضاعفۃ" کا ہے کہ جرم کی شناعت بیان کرنے کے لئے ایک خاص صورت ذکر کر دی گئی ہے ورنہ اگر یہ قانونی شرط ہوتی تو سورۂ بقرہ کی آیت میں یہ نہ کہا جاتا کہ ربا سے توبہ کی صورت میں صرف راس المال قرض خواہ کو ملے گا، اور ساری رقم اسے چھوڑنی ہو گی۔

(۲) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اصل رقم پر لیا جانے والا ہر اضافہ "ربا" اور حرام ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام شافعی اور امام ابن ابی حاتمؒ آپ کا یہ ارشاد روایت فرماتے ہیں

الا ان کل ربا کان فی الجاھلیة موضوع عنکم کله ، لکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون ، واول ربا موضوع ربا العباس بن عبدالمطلب کله

(تفسیر ابن کثیر ص ۳۳۱ ج۱ مطبوعہ ۱۳۵۶ھ) یعنی سنو کہ ہر وہ ربوا جو جاہلیت میں واجب تھا تم سے پورا کا پورا ختم کر دیا گیا۔ تمہارے لئے قرض کی صرف اصل رقم ہے۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے اور سب سے پہلے جو ربا ختم کیا گیا وہ عباس ابن مطلب کا ربا ہے جو پورے کا پورا ختم کر دیا گیا۔ نیز آپ نے ربا کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "کل قرض جرّ منفعۃ فھو ربا" ہر وہ قرض جو کوئی نفع کھینچ لائے، ربا ہے (الجامع الصغیر للسیوطی بحوالہ حارث بن ابی اسامہ ص ۹۴ ج۱ حدیث ۶۳۳۶) یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہونے کی بنا پر حسن لغیرہ ہے (السراج المنیر للعزیزی ص۸۶ ج۳)

چنانچہ صحابہ و تابعین بھی "ربا" کا مطلب سمجھتے تھے کہ قرض پر طے کر کے لیا جانے والا ہر اضافہ "ربا" ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ حضرت فضالۃ بن عبید رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، وہ ربا کی یہ تعریف کرتے ہیں: کل قرض جر منفعۃ فھو وجہ من وجوہ الربا۔ ہر وہ قرض جو کوئی منفعت کھینچ لائے وہ ربا کی اقسام میں داخل ہے۔ (السنن الکبری للبیہقی ص۳۵۰ ج۵) اور امام بخاری نے کتاب الاستقراض "باب اذااقرضہ الی اجل مسمی" میں حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ قول تعلیقاً نقل کیا ہے کہ

قال ابن عمر فی القرض الی اجل لا باس به و ان اعطی افضل من دراھمه مالم یشترط (صحیح بخاری ص۳۲۳ ج۱)

معین مدت کے لئے قرض دینے میں کوئی حرج نہیں، خواہ قرض دار اس کے دراہم سے بہتر دراہم ادا کرے بشرطیکہ (یہ بہتر دراہم ادا کرنا) قرض کے معاہدے میں طے نہ کیا گیا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معاہدہ میں یہ طے کر لیا جائے کہ قرض کے دراہم سے بہتر دراہم ادا کئے جائیں گے تو وہ ربا میں داخل ہو کر حرام ہو گا۔

نیز حضرت ابوبردۃ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے مجھے نصیحت کی کہ تم ایک ایسی سرزمین میں آباد ہو جہاں ربا بہت عام ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص پر تمہارا قرض واجب ہو اور وہ تمہیں بھوسے، جو یا چارے کا بوجھ ہدیۃً دینا چاہے تو تم اسے قبول نہ کرو۔ کیونکہ وہ ربا ہے (صحیح بخاری۔ مناقب عبداللہ بن سلام ص۵۳۸ ج۱)

اور حضرت قتادہ بن دعامتہ الدوسی آیت "وان تبتم فلکم روس اموالکم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ماکان لهم من دین فجعل لهم ان یاخذوا رءوس اموالهم ولا یزدادوا علیه شیئا

(تفسیر ابن جریر ص۶۷ ج۳) جس شخص کا کچھ قرض دوسرے پر ہو۔ اس کے لئے قرآن نے اصل رقم لینے کی اجازت دی لیکن اس پر ذرا بھی اضافہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

(۴) علماء لغت نے بھی "ربا" کی یہی تشریح کی ہے، چنانچہ لغت عرب کے مشہور امام زجاج ربا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں! "کل قرض یوخذبہ اکثر منہ" (تاج العروس ص۱۴۲ ج۱) یعنی ہر وہ قرض جس کے ذریعہ اس سے زیادہ رقم وصول کی جائے۔ نیز لسان العرب وغیرہ میں بھی ربا کی یہی تعریف نقل کی گئی ہے۔

چنانچہ امت کے تمام علماء و فقہاء بلا اختلاف "ربا" کی یہی تعریف کرتے آئے ہیں۔ امام ابو بکر جصاص احکام القرآن میں اہل جاہلیت کے ربا کی قانونی اور جامع و مانع تعریف اس طرح فرماتے ہیں۔

هو القرض المشروط فیه الاجل و زیادة مال علی المستقرض۔ (احکام القرآن ص۵۵۷ ج۱)

قرض کا وہ معاملہ جس میں ایک مخصوص مدت ادائیگی اور قرض دار پر مال کی کوئی زیادتی طے کر لی گئی ہو۔

مذکورہ بالا تصریحات نے "ربا" کے مفہوم میں کوئی گنجلک یا ابہام و اجمال باقی نہیں چھوڑا، اور ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کے معاملہ میں قرض دار کے ذمہ اصل پر جو اضافہ بھی معاہدے میں طے کر کے لیا اور دیا جائے وہ "ربا" ہے، اس میں کم یا زیادہ، یا مفرد و مرکب کی کوئی تخصیص نہیں ہے، یہی قرآن و سنت کا حکم ہے، یہی اجماع امت کا فیصلہ ہے، اور اسلامی شریعت میں اس کے سوا کسی نظریہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(ب) کیا ظہور اسلام کے بعد ہونے والی ترقی اور تبدیلیوں کے پیش نظر "ربا" کی نئی تشریح کی جا سکتی ہے؟

اس کا مختصر جواب ہے کہ کہ ہرگز نہیں۔ جس چیز کی تشریح خود قرآن و حدیث نے کر دی ہو، جس پر فقہاء صحابہ و تابعین متفق رہے ہوں، اور جس پر امت کا اجماع متفق ہو چکا ہو اس کی "نئی تشریح" درحقیقت قرآن و سنت کی تحریف کا نام ہے اور ایسی نئی تشریحات کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا کوئی حکم صحیح و سالم باقی نہ رہے۔ اگر محض زمانے کے

عام چلن سے متاثر ہو کر "ربا" کی کوئی ایسی نئی "تشریح" کی جا سکتی ہے جو قرآن و سنت اور اجماع کے صریح ارشادات کے خلاف ہو تو "خمر"، "زنا" یہاں تک کہ "کفر" و "شرک" کی نئی تشریح بھی ممکن ہو گی پھر اسلام کا کون سا حکم تحریف و ترمیم کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا ہے؟

شریعت کے جو احکام زمانے کی تبدیلی سے متاثر ہونے والے تھے، ان کے بارے میں خود قران و سنت نے صریح اور تفصیلی احکام دینے کے بجائے کچھ اصول بتا دیئے ہیں جن کی روشنی میں شریعت کے اصولوں کے تحت احکام مستنبط کئے جا سکیں، لہٰذا جہاں قرآن و سنت کے احکام منصوص اور واضح ہیں اور ان میں آئندہ کسی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کی گئی، ان پر قیام قیامت تک جوں کا توں عمل ضروری ہے۔ اگر زمانے کی تبدیلی سے واقعتہً "ربا" کے حکم میں کوئی تبدیلی ہونی تھی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم "ربا" کی شناعت بیان کرنے کے لئے پورے دو رکوع نازل کرتا ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیتا ہے، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس پر شدید ترین وعیدیں بیاں فرماتے ہیں، لیکن قرآن و سنت میں کسی جگہ اس بات کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ملتا کہ یہ حکم کسی زمانے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے آئندہ زمانے کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد کتب حدیث میں ملتا ہے وہ تو یہ ہے:

لیأتین علی الناس زمان لا یبقی منهم أحد إلا أکل الربا، فمن لم یأکله اصابه من غباره (ابو داؤد و ابن ماجہ) یعنی لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہ بچے گا جس نے سود نہ کھایا ہو، اور جس شخص نے واقعی سود نہ کھایا ہو گا، اس کو سود کا غبار تو ضرور ہی پہنچے گا۔"

نیز یہ ارشاد ہے۔ "بین یدی الساعة یظهر الربا و الزنا والخمر" (طبرانی ورواتہٗ رواۃ الصحیح) قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب کی کثرت ہو جائے گی۔

ان احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صراحتہً بتلا رہے ہیں کہ آئندہ ایک زمانہ ایسا آ جائے گا جب سود یا اس کے غبار سے بچنا مشکل ہو گا، اس کے باوجود آپ اس سود کو "ربا" ہی قرار دیتے ہیں، اور کوئی ادنیٰ اشارہ بھی ایسا نہیں دیتے کہ اس دور میں ربا کی "نئی تشریح" کر کے اسے حلال کر لینا چاہئے۔ پھر حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق آج ربا کی کثرت کا مشاہدہ ہو رہا ہے، لیکن جس ربا کی کثرت ہے وہ تجارتی سود ہے کیونکہ مہاجنی سود کی تو ایسی

زیادتی نہ ہوئی ہے نہ آئندہ بظاہر امکان ہے کہ اس سے کوئی انسان خالی نہ رہے یہ بنکوں ہی کا سود ہے جس کے اثرات ہر کس و ناکس تک پہنچتے ہیں۔ اس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے اس میں تجارتی اور مہاجنی ہر طرح کے سود شامل ہیں۔

سوال نمبر ۲ "کیا اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق
(۱) دو مسلم ریاستوں کے درمیان یا (۲) ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم ریاست کے مابین سود کی بنیاد پر کاروبار جائز ہے؟

جواب۔ جہاں تک دو مسلم ریاستوں کا تعلق ہے ان کے درمیان سود کے لین دین کی کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف رہا ہے کہ کسی غیر مسلم ریاست سے سود لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس کی وجہ سود کا جواز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ دارالحرب میں رہنے والے کافروں کا مال ان کی رضا مندی سے وصول کر کے اس پر قبضہ کر لینا ان فقہاء کے نزدیک جائز ہے، دارالحرب کے کفار وہ مال خواہ کوئی نام رکھ کر دیں، ان فقہاء کے مسلک کے مطابق مسلمان اسے بحیثیت سود نہیں بلکہ اس حیثیت سے وصول کر سکتے ہیں کہ وہ ایک حربی کا مال مباح ہے، لہٰذا اضطراری حالات میں اس نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کی گنجائش ہے۔

سوال نمبر ۳ حکومت قومی ضروریات کے لئے جو قرضے جاری کرتی ہے کیا ان پر لاگو ہونے ولا سود ربا کے ذیل میں آتا ہے؟

جواب نمبر ۳۔ بلاشبہ ربا کے ذیل میں آتا ہے، کیونکہ "ربا" جس طرح انفرادی طور پر مسلمان کے لئے حرام ہے اسی طرح حکومت کے لئے حرام ہے۔

سوال نمبر ۴ "کیا آپ کے خیال میں غیر سودی بنکاری ممکن ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کن مفروضات کے مطابق"؟

جواب نمبر ۴ غیر سودی نظام بنکاری بلاشبہ ممکن ہے۔ اس کی تفصیلات تو اس مختصر سوالنامے کے جواب میں نہیں سما سکتیں، لیکن اس کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے: اس پر عمل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس نظام کی مکمل تفصیلات مدون کرنے کے لئے صاحب بصیرت فقہاء اور ماہرین معاشیات و بنکاری کی ایک مجلس خاص اسی غرض کے لئے بنائی جائے جو ربا کی حلت و حرمت کی بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مثبت طور پر غیر سودی نظام بنکاری کی تفصیلات مرتب کرے۔

خاکہ درج ذیل ہے:

اسلامی احکام کے مطابق بنکاری "ربا" کے بجائے "شرکت" اور "مضاربت" کے اصولوں پر استوار کی جائے گی جس پر عمل مندرجہ ذیل طریقے سے ہو گا۔

عوام جو رقمیں بنک میں رکھوائیں گے وہ دو قسم پر مشتمل ہوں گی، عندالطلب قرضے (Current Account) اور دوسرے مدمضاربت (Fixed Deposit) سیونگ اکاؤنٹ پہلی قسم میں شامل ہو جائے گا۔

عندالطلب قرضوں میں تمام رقوم بنک کے پاس فقہی نقطۂ نظر سے قرض ہوں گی۔ کھاتہ دار ہر وقت بذریعہ چیک ان کی واپسی کا مطالبہ کر سکے گا، اور ان پر منافع کھاتہ دار کو نہیں دیا جائے گا۔ جب کہ موجودہ نظام میں بھی اس مد پر کوئی سود نہیں دیا جاتا۔ البتہ مضاربت کے کھاتہ دار معین مدت کے لئے جو تین ماہ سے ایک سال تک ہو سکتی ہے رقم رکھوائیں گے، اور اس رقم سے بنک (اس طریقے کے مطابق جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) جو منافع حاصل کرے گا اس میں متناسب طور سے (Proportionately) شریک ہوں گے۔ یعنی ان کی رقم کل لگے ہوئے سرمایہ (Invested Money) کا جتنا فی صد حصہ ہے، بنک کے کل منافع میں سے اتنا ہی فی صد حصہ انہیں ملے گا۔

عندالطلب قرضوں اور مضاربت کھاتہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقوم میں سے بنک ایک حصہ مد محفوظ (Reserve) کے طور پر رکھ کر باقی سرمایہ کاروباری افراد کو شرکت یا مضاربت کے اصول پر دے گا۔ کاروباری افراد اس سرمایہ کو صنعت یا تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل کریں گے اس کا ایک طے شدہ فی صد حصہ بنک کو اصل رقم کے ساتھ ادا کریں گے۔ اور بنک یہ نفع اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں کے درمیان طے شدہ متناسب حصوں کی صورت میں تقسیم کرے گا۔

مذکورہ طریق کار کے علاوہ غیر سودی نظام میں بنک اپنے وہ تمام وظائف بھی جاری رکھے گا جو وہ اجرت پر انجام دیتا ہے، مثلاً لاکرز، ٹریولز چیک، بنک ڈرافٹ، اور لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنا بیع و شرا کی دلالی، کاروباری مشورے دینا وغیرہ ان تمام خدمات کو بدستور جاری رکھ کر ان پر اجرت وصول کی جا سکے گی۔

یہ غیر سودی بنکاری کے لئے انتہائی مجمل اشارات ہیں۔ اس موضوع پر مفصل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں اس نظام کی جزوی تفصیلات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ذاتی طور پر

متعدد ماہرین بنکاری سے مشوروں کے دوران انہوں نے اس طریق کار کو بالکلیہ قابل عمل قرار دیا ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے صحیح طریقہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ خاص اس غرض کے لئے ماہرین کی ایک مجلس بنا دی جائے جو غور و خوض کے بعد اس نظام کی عملی تفصیلات مرتب کرے۔

سوال نمبر ۵ کیا اسلامی احکام کی روشنی میں بنکوں کی فراہم کردہ سہولتوں یا خدمات کے عوض سود کی وصولی کے سلسلہ میں نجی اور سرکاری بنکاری میں کوئی امتیاز کیا جا سکتا ہے؟

جواب نمبر ۵۔ اسلامی احکام کے اعتبار سے نجی بنکوں اور سرکاری بنکوں میں کوئی فرق نہیں جن خدمات کی اجرت لینا نجی بنکوں کے لئے جائز ہے ان کی اجرت سرکاری بنکوں کے لئے بھی جائز ہے۔ اور سود کے معاملات نہ نجی بنکوں کے لئے جائز ہے نہ سرکاری بنکوں کے لئے۔

سوال نمبر ۶ کیا حکومت کے مملوکہ یا اس کے زیر نگرانی چلنے والے بنکاری کے کسی ادارے کو نامعلوم مالک کی ملکیت (مال مجہول المالک) قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اسلام کی رو سے ایسے ادارے کی کیا حقیقت ہو گی؟

جواب نمبر ۶۔ جو بنک حکومت نے قائم کئے ہوں وہ حکومت کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا انہیں مجہول المالک اموال میں داخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۷ (الف) آیا اسلامی تعلیمات کے بموجب سرمایہ کو عامل پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس کے استعمال کے عوض کوئی معاوضہ دیا جا سکتا ہے؟

(ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو آیا اسلام منافع کی تقسیم میں سرمایہ کا کوئی حصہ مقرر کرتا ہے۔؟

جواب نمبر ۷۔ یہ ایک نظریاتی بحث ہے جسے صراحتہً قرآن و سنت میں نہیں چھیڑا گیا، البتہ اس سلسلہ میں قرآن و سنت کے احکام سے جو صحیح پوزیشن سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "سرمایہ" کو عامل پیداوار شمار کیا گیا ہے، البتہ جس چیز کو آج کل علم معاشیات میں سرمایہ یا اصل (Capital) کہا جاتا اور جس کی تعریف پیدا شدہ ذریعہ پیدائش سے کی جاتی ہے۔ وہ

اسلامی شریعت کے اعتبار سے دو قسموں پر منقسم ہے:۔

(۱) وہ سرمایہ جس کا عمل پیداوار میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے خرچ نہ کیا جائے جیسے روپیہ اور اشیاء خوردنی۔

(۲) وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصل شکل و صورت برقرار رہتی ہے مثلاً مشینری۔

تقسیم دولت میں ان دو قسموں میں سے پہلی قسم کا حصۂ منافع (Profit) ہے نہ کہ سود اور دوسری قسم کا حصہ زمین کی طرح اجرت یا کرایہ (Reant) ہے

یہاں مختصراً اتنا اشارہ کافی ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور اس کی فنی تفصیلات احقر کے مقالے "اسلام کا نظام تقسیم دولت" میں موجود ہیں۔ جو ساتھ منسلک ہے۔

سوال نمبر ۸ (الف) کیا آپ کے خیال میں موجودہ اقتصادی حالات میں بنکاری کی سہولتوں سے استفادہ کئے بغیر یا ایسی سہولتوں کے عوض سود یا بنکاری کے اخراجات ادا کئے بغیر ملکی اور غیر ملکی تجارت کو مؤثر طریقہ سے چلانا ممکن ہے؟

(ب) اگر مندرجہ بالا سوال کا جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اسلامی احکام سے ہم آہنگ کوئی متبادل تجویز کر سکتے ہیں؟

جواب نمبر ۸۔ جی ہاں۔ ممکن ہے۔ یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بنک اپنی جن خدمات پر اجرت وصول کرتا ہے مثلاً لاکرز، لیٹرز آف کریڈٹ، بنک ڈرافٹ۔ بیع و شراکی دلالی وغیرہ، ان کی اجرت لینا جائز ہے۔ البتہ سود کا کاروبار ناجائز ہے، اور اس کی متبادل صورت سوال نمبر ۴ کے جواب میں آ چکی ہے۔

سوال نمبر ۹ کیا بیمہ کا کاروبار سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے؟

جواب نمبر ۹۔ جی ہاں۔ اور اس کی صحیح اسلامی صورت یہ ہے کہ:۔

(۱) بیمہ پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت میں لگایا جائے اور معین سود کے بجائے اسی طریقے پر تجارتی نفع تقسیم کیا جائے جس کا ذکر غیر سودی بنکاری کے ذیل میں آیا ہے۔

(۲) بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا کاروبار بنانے کے لئے بیمہ پالیسی لینے والے اپنی رضامندی سے اس معاہدے کے پابند ہوں کہ اس کاروبار کے منافع کا ایک متعدبہ حصہ نصف یا تہائی یا چوتھائی ایک ریزرو فنڈ کی صورت میں محفوظ رکھ کر اسے وقف قرار دیں گے، اور اسے حوادث میں مبتلا ہونے والے افراد کی امداد پر خاص اصول و قواعد کے ماتحت خرچ کیا جائے گا۔

(۳) بصورت حوادث یہ امداد صرف ان حضرات کے ساتھ مخصوص ہو گی جو اس معاہدے کے پابند اور اس کمپنی کے حصہ دار ہیں۔ اوقاف میں ایسی تخصیصات شرعاً جائز ہیں وقف علی الاولاد اس کی نظیر موجود ہے۔

(۴) اصل رقم مع تجارتی نفع کے ہر فرد کو پوری پوری ملے گی الاّ یہ کہ کاروبار میں خسارہ ہو اور وہی اس کی ملک سمجھی جائے گی۔ امداد باہمی کا ریزور فنڈ وقف ہو گا۔ جس کا فائدہ وقوع حادثہ کی صورت میں اس وقف کرنے والے کو بھی پہنچے گا، اور اپنے وقف سے خود کوئی فائدہ اٹھانا اصول وقف کے منافی نہیں جیسے کوئی رفاہ عام کے لئے ہسپتال وقف کر دے پھر بوقت ضرورت اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے یا قبرستان وقف کر دے پھر خود اس کی اور اس کے اقربا کی قبریں بھی اس میں بنائی جائیں۔

(۵) حوادث پر امداد کے لئے مناسب قوانین بنائے جائیں جو صورتیں عام طور پر حوادث کہی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں پسماندگان کی امداد کے لئے معتدبہ رقم مقرر کی جائے، اور جو صورتیں عادتاً حوادث میں داخل نہیں سمجھی جاتیں جیسے کسی بیماری کے ذریعہ موت واقع ہو جائے۔ اس کے لئے یہ کیا جاسکتا ہے کہ متوسط تندرستی والے افراد کے لئے ساٹھ سال کو عمر طبعی قرار دے کر اس سے پہلے موت واقع ہو جانے کی صورت میں کچھ مختصر امداد دی جائے متوسط تندرستی کو جانچنے کے لئے جو طریقہ ڈاکٹری معائنہ کا بیمہ کمپنی میں جاری ہے وہ استعمال کیا جاسکتا ہے اور بیمار یا کمزور آدمی کے لئے اسی پیمانہ سے عمر طبعی کا ایک اندازہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(٦) کوئی شخص چند قسطیں جمع کرنے کے بعد سلسلہ بند کر دے تو اس کی رقم ضبط کر لینا جیسا کہ آج کل معمول ہے ظلم صریح اور حرام ہے۔ البتہ کمپنی کو ایسے غیر محتاط لوگوں کے ضرر سے بچانے کے لئے معاہدے کی ایک شرط یہ رکھی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص حصہ دار بننے کے بعد اپنا حصہ واپس لینا چاہے یعنی شرکت کو ختم کرنا چاہے تو پانچ یا سات یا دس سال سے پہلے

رقم واپس نہ کی جائے گی۔ اور ایسے شخص کے لئے تجارتی نفع کی شرط بھی کم رکھی جا سکتی ہے۔ یہ سب امور منتظمہ کمیٹی کی صوابدید سے طے ہو سکتے ہیں۔ ان کا اثر معاملہ کے جواز یا عدم جواز پر نہیں پڑتا۔

یہ ایک سرسری وا جمالی خاکہ ہے۔ اگر کوئی جماعت اس کام کے لئے تیار ہو تو اس پر مزید غور و فکر کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نافع بنانے اور نقصانات سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچی جا سکتی ہیں۔ اور سال دو سال تجربہ کر کے ان میں بھی شرعی قواعد کے تحت تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بنکنگ اور انشورنش کا مروجہ نظام بھی تو راتوں رات وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ اس پر غور و فکر اور تجربات میں ایک عرصہ لگا ہے اگر صحیح جذبہ کے ساتھ مذکورہ بالا طریقے کا تجربہ کیا جائے، اور تجربات کے ساتھ شرعی قواعد کے ماتحت اصلاحات کا سلسلہ جاری رہے تو یقیناً چند سال میں غیر سودی بنکاری اور بیمہ وغیرہ کا نظام شرعی اصول پر پورے استحکام کے ساتھ بروئے کار آ سکتا ہے۔

سوال نمبر ۱۲ (۱) پراویڈنٹ فنڈ اور سیونگز بنک اکاؤنٹ پر جو نفع دیا جاتا ہے کیا وہ ربا کی تعریف میں آتا ہے؟

جواب نمبر ۱۲۔ جہاں تک سیونگز اکاؤنٹ کا تعلق ہے اس پر دیا جانے والا نفع بلاشبہ ربا ہے۔ کیونکہ وہ ربا کی اس تعریف میں داخل ہے جس کی تشریح سوال نمبر ۱ کے جواب میں کی گئی ہے۔ رہا پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ سو اس کا بھی صاف اور بے غبار طریقہ تو یہی ہے کہ اس فنڈ کو بھی شرکت یا مضاربت کے اصول پر تجارت میں لگایا جائے اور اس سے جو تجارتی نفع حاصل ہو وہ فنڈ کے حصہ داران میں ان کے حصوں کے بقدر تقسیم کیا جائے لیکن آج کل جو طریقہ مروج ہے کہ محکمہ اس فنڈ کو تجارت وغیرہ میں لگا کر حصہ داروں کو سود کے نام سے کچھ معین رقوم دیتا ہے ملازمین کے لئے ان کے لینے کی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ فقہی اعتبار سے وہ ربوا کی تعریف میں نہیں آتی وجہ یہ ہے کہ تنخواہ کا جو حصہ ملازم کو وصول نہیں ہوا وہ ابھی اس کی ملک میں نہیں آیا بلکہ بدستور محکمہ ہی کی ملک میں ہے۔ اب محکمہ یا گورنمنٹ نے جو زیادتی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے تجارت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کی وہ زیادتی ملازم کی حقیقی ملک سے فائدہ اٹھانے

---

(۱) (نوٹ) جواب کی سہولت کے پیش نظر سوال نمبر ۱۲ کو مقدم اور ۱۱ کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔

کا نتیجہ نہیں، بلکہ اپنی ملک سے فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہے۔ اب اگر محکمہ اپنی ملک سے ملازم کو کوئی حصہ دیتا ہے تو وہ شرعاً سود نہیں بلکہ تبرع ابتدائی یعنی انعام ہے اس لئے ملازم کے لئے اسے وصول کرنا جائز ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل احقر کے ایک رسالہ "پراویڈنٹ فنڈ" میں موجود ہے جس کی دوسرے حضرات علماء نے بھی تصدیق فرمائی ہے۔ یہ رسالہ جواب کے ساتھ منسلک ہے۔

سوال نمبر ۱۱ (الف) ایک ملازم کو اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے پر جو رقم بطور سود ادا کرنا پڑتی ہے اور جو بعد میں اس کے اسی فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے کیا آپ اسے ربا کہیں گے؟

جواب نمبر ۱۱۔ پراویڈنٹ فنڈ کے معاملہ کی جو تشریح سوال نمبر ۱۲ کے جواب میں کی گئی ہے اس کی روشنی میں شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ نہ قرض ہے نہ سودی معاملہ۔ قرض تو اس لئے نہیں کہ ملازم کا جو قرض محکمہ کے ذمہ تھا اور جس کے مطالبے کا اسے حق تھا اس نے اسی کا ایک حصہ وصول کیا ہے۔ اور بعد کی تنخواہوں سے جو رقم ادائے قرض و سود کے نام سے بالاقساط کاٹی جاتی ہے وہ بھی ادائے قرض نہیں بلکہ فنڈ میں جو رقم معمول کے مطابق ہر ماہ کٹتی تھی، اسی کی طرح یہ بھی ایک کٹوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان مہینوں میں کٹوتی کی مقدار زیادہ ہو گی جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ سب رقم بالآخر اسی کو واپس ملے گی۔

(ب) اگر آجر بھی پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی طرف سے کچھ رقم کا اضافہ کرے تو صورت حال کیا ہو گی؟ اس سے بھی مذکورہ صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ آجر جس رقم کا اپنی طرف سے اضافہ کر رہا ہے وہ اس کی طرف سے تبرع (ایک طرح کا انعام) ہے۔

سوال نمبر ۱۳ کیا انعامی بانڈوں پر یا سیونگ بنک اکاؤنٹ پر بطور انعام دی جانے والی رقم ربا کی تعریف میں داخل ہے؟

جواب نمبر ۱۳۔ انعامی بانڈز میں یہ ہوتا ہے کہ بانڈ خریدنے والے ہر شخص کی رقم پر سود لگایا جاتا ہے، لیکن معینہ مدت پوری ہونے پر ہر شخص کا سود اسی کو دینے کے بجائے سود کی مجموعی رقم صرف ان افراد کو تقسیم کر دی جاتی ہے جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل آئے لہٰذا جو رقم بانڈ پر "انعام" کے نام سے دی جاتی ہے وہ درحقیقت سود اور ربا ہے فرق یہ ہے کہ عام حالات میں اتنی رقم پر جتنا سود ملتا ہے، بانڈ کے "انعام" میں اتنے ہی سود کے علاوہ بعض دوسرے افراد کی رقموں پر لگنے والا سود بھی شامل ہوتا ہے جو انعام یافتگان کو بذریعہ قمار دیا جاتا ہے۔

اس طرح انعامی بانڈز کے مروجہ طریقے سے سود کی رقم کو قمار کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ البتہ اہل علم کے مشورے سے اس طریقے میں ایسی ترمیم کی جا سکتی ہے جس کے ذریعہ اس میں سود اور قمار باقی نہ رہے۔

رہا سیونگ بنک اکاؤنٹ، سو اس کے بارے میں پیچھے بار بار عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ خالص ربا کا معاملہ ہے، لہٰذا اس پر انعام کے نام سے جو رقم دی جائے گی وہ "عقد ربا" پر دیا جانے والا انعام ہے جس کا لینا جائز نہیں۔

سوال نمبر ۱۴"کیا اسلامی قانون کے تحت تجارتی اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کرنا درست ہو گا جب کہ تجارتی قرضوں پر سود لیا جائے اور غیر تجارتی قرضے بلا سود ہوں؟

جواب نمبر ۱۴۔ سوال نمبر ا کے جواب میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ "ربا" کی حقیقت ہر وہ زیادتی ہے جو کسی قرض کے مقابلہ میں طے کر کے لی اور دی جائے اس میں یہ سوال قطعی خارج از بحث ہے کہ قرض لینے والا کس مقصد کے لئے قرض لے رہا ہے؟ اس معاملے میں اصل یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کو قرض دے رہا ہے اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو پہلے یہ متعین کرنا چاہئے کہ وہ یہ روپیہ اس شخص کی امداد کے طور پر دے رہا ہے یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہے، اگر وہ یہ روپیہ دوسرے کی امدد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداو ہی رہنے دے اور نفع کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے وہ اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہو گا جتنے اس نے قرض دیئے تھے اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا، یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان دونوں کی ذمہ داری اٹھانے پڑے گی ان دو صورتوں کے علاوہ اسلام میں تیسری راہ نہیں ہے جس کے ذریعہ کوئی فریق اپنا نفع ہر حال میں متعین کر لے جب کہ دوسرے کا نفع موہوم اور مشتبہ ہو۔

سوال نمبر ۱۰کیا اسلام کے اقتصادی نظام میں قومی سرمایہ کی تشکیل کے لئے بچت کی حوصلہ افزائی کرنے والی کوئی جائز ترغیبات موجود ہیں؟

سوال نمبر۱۵ اگر سود کو قطعی طور پر ختم کر دیا جائے تو اسلامی نظام معیشت میں لوگوں کو بجٹ پر ابھارنے اور سرمایہ کے استعمال میں کفایت شعاری

کی ترغیب دینے کے لئے کونسے محرکات استعمال کئے جائینگے ؟

جواب نمبر ۱۰۔ ۱۵ یہ دونوں سوال در حقیقت ایک ہی ہیں۔ اور ان کا جواب یہ ہے کہ اگر بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو کھاتہ داروں کو آج کی معمولی شرح سود سے کہیں زیادہ منافع حاصل ہو گا، کیونکہ وہ پورے کاروبار کے شریک ہوں گے۔ لہٰذا جو بچت قومی مقاصد کے لئے ضروری ہے اس کے لئے اس سے بڑھ کر ترغیبی نظام اور کیا ہو گا؟

صرف سیونگ اکاؤنٹ کا مسئلہ رہ جاتا ہے، کیونکہ غیر سودی نظام میں نہ اس پر سود ملے گا اور نہ منافع، لیکن اول تو جدید ماہرین معاشیات کی عام رائے یہ ہے کہ سیونگ اکاؤنٹ کی معمولی شرح سود بچت کے لئے کوئی قوی اور فیصلہ کن محرک نہیں ہوتی بچت کی اصل وجہ بذات خود کفایت شعاری اور پس اندازی ہی کا جذبہ ہوتا ہے اس لئے سیونگ اکاؤنٹ پر سود نہ دینے سے اس مد میں کوئی معتدبہ کمی واقع نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ مد مضاربت (Fixed Deposite)کی مدتیں کم کر کے تین ماہ سے ایک سال تک بھی رکھی جا سکتی ہیں اس طرح بچت کے ساتھ نفع کے خواہش مند اس مد کی طرف بآسانی رجوع کر سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۶ جدید معاشی نظریہ کے طور پر سود کے معنی اس شرح سود سے مختلف ہو گئے ہیں جو قرض پر واقعی ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں ماہرین معاشیات "فرضی شرح سود" سے کام لیتے ہیں جس سے سرمایہ کی کمیابی کی قیمت ظاہر ہوتی ہے کیا اس قسم کا نظریہ اقتصادی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے خواہ واقعی سود ادا کیا جائے یا نہ ادا کیا جائے۔

جواب نمبر ۱۶۔ سوال پوری طرح واضح نہیں ہے تاہم اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی وغیرہ میں فرضی شرح سود کو بنیاد بنا کر فیصلے کئے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی ضرورت وہیں پیش آ سکتی ہے جہاں سود عملاً جاری و ساری بھی ہو، لیکن اگر معیشت کو غیر سودی نظام کے مطابق استوار کر لیا جائے تو فرضی شرح سود کی کوئی ضرورت یا فائدہ باقی نہ رہے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مفتی محمد شفیع

ذکر و فکر

غیر سودی کاؤنٹرز

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا
اور
درود و سلام اس کے آخری پیغمبرؐ پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے حکومت نے بلاسود بنکاری کے آغاز کا اعلان کیا ہے، اور ہر بینک میں "غیر سودی کاؤنٹر" کھول دیئے گئے ہیں، حکومت کا کہنا ہے کہ یہ "بلا سود بنکاری" کی طرف پہلا قدم ہے اور آئندہ بینکنگ کے پورے نظام کو رفتہ رفتہ غیر سودی نظام میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

سود جیسی لعنت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ایک اسلامی حکومت کا اہم ترین فریضہ ہے، اور جس دن ہماری معیشت اس شیطانی چکر سے نجات پا گئی، وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری انسانیت کے لئے روز سعید ہو گا، موجودہ حکومت نے بار بار اپنےاس عزم کا اعلان کیا ہے کہ وہ ملکی معیشت کو غیر سودی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتی ہے، اور ایک ایسے ماحول میں جہاں بینکوں کے سود کو حلال طیب قرار دینے کی شرمناک کوششیں جاری رہی ہیں، حکومت کی طرف سے اس عزم کے اظہار کو بھی مسلمانوں نے غنیمت سمجھا، اور اس نیک کام کی طرف جو قدم بھی آگے بڑھایا جائے اسے ماضی میں مستحسن ہی قرار دیا جائے گا، اس لئے ان نئے "غیر سودی کاؤنٹروں" کے افتتاح کےبعد مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے اکاؤنٹ ان کاؤنٹروں میں کھلوانے شروع کر دیئے۔

ذاتی طور پر اگرچہ ہمیں اس طریق کار سے شدید اختلاف تھا کہ سودی اور غیر سودی کاؤنٹر متوازی طور پر ساتھ ساتھ چلائے جائیں، مگر جب ان کاؤنٹروں کا افتتاح ہوا تو اس اقدام کو

ماضی کے مقابلے میں بہرحال غنیمت سمجھتے ہوئے ہمارا فوری اور پہلا تاثر یہ تھا کہ ان کاؤنٹروں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ عرصۂ دراز کی تمناؤں اور جدوجہد کے بعد اس کام کا آغاز ہو رہا ہے جس کے انتظار میں ایک تہائی صدی بیت گئی ہے، خیال یہ تھا کہ حکمت عملی خواہ کیسی ہو، لیکن غیر سودی بنکاری کا قیام بہرصورت ایک ایسا نیک کام ہے جس میں تعاون خیر ہی خیر ہے، چنانچہ اس کار خیر میں تعاون اور حصہ داری کے جذبے کے ساتھ ہم نے اس کی اسکیم کا مطالعہ کیا ــــ لیکن افسوس اور شدید افسوس، حسرت اور شدید حسرت اس بات کی ہے کہ ان کاؤنٹروں کے تفصیلی طریق کار کو دیکھنے کے بعد یہ جذبہ بڑی حد تک سرد پڑ گیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۱ء کے بعد اطراف و اکناف سے تحریری اور زبانی طور پر ہم سے یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ کیا ان کاؤنٹروں سے واقعتہً سود ختم ہو گیا ہے؟ اور کیا ایک مسلمان سود کے کسی خطرے کے بغیر ان کاؤنٹروں میں رقم رکھوا سکتا ہے؟

ان سوالات کا علی وجہ البصیرت جواب دینے کے لئے جب ہم نے اس اسکیم کا مطالعہ کیا جو یکم جنوری سے نافذ کی گئی ہے، اور اس کے طریق کار کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ سود کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی ذہنیت اتنی آسانی سے اس نجاست کا خاتمہ کرنے کے لئے تیار نہیں، بلکہ وہ اس پر تھوڑا سا عطر چھڑک کر اور کچھ خوش نما پالش کر کے کچھ مزید عرصے تک کام چلانا چاہتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ابھی نہ صرف اور انتظار کرنا ہو گا، بلکہ سود کی گرتی ہوئی دیوار کو ــــ جو انشاء اللہ بالآخر گر کر رہے گی ــــ صحیح طرح سے ڈھانے کے لئے ابھی اور جدوجہد کرنی ہو گی۔

چونکہ عام طور پر مسلمانوں بلکہ بیشتر علماء کو بھی اس نئی اسکیم کی تفصیلات پہنچ نہیں سکیں، اس لئے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنے علم و بصیرت کی حد تک اس اسکیم پر تبصرہ پیش کریں، تاکہ حکومت، عوام اور علماء اس کی روشنی میں راہ عمل طے کر سکیں۔

بینکوں کو غیر سودی نظام پر کس طرح چلایا جائے؟ اور معیشت کے لئے سود کی متبادل اساس کیا ہو؟ اس مسئلے پر مدت دراز سے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں سوچا جا رہا ہے اور اس پر بہت سا علمی اور تحقیقی کام ہو چکا ہے، فکر و تحقیق کی ان تمام کاوشوں کو سامنے رکھنے کے بعد ایک بات تقریباً تمام تجاویز میں مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ کہ سود کے اصل متبادل طریقے صرف دو ہیں:۔ ایک نفع و نقصان کی تقسیم یعنی شرکت یا مضاربت اور دوسرے

قرض حسن ـــــ لہٰذا سود کو ختم کرنے کے بعد بنکاری کا سارا نظام بنیادی طور سے انہی دو طریقوں پر مبنی ہونا چاہئے، البتہ بینک کو بعض ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کی انجام دہی کے لئے نہ وہ شرکت و مضاربت کا طریقہ اپنا سکتا ہے، اور نہ قرض حسن کا۔ ایسے مقامات پر جزوی طور سے کچھ دوسرے طریقے بھی مختلف حضرات نے تجویز کئے ہیں، یہ طریقے پورے نظام بنکاری کی بنیاد نہیں بن سکتے، بلکہ انہیں استثنائی یا عبوری طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

بلا سود بنکاری پر اب تک جو علمی اور تحقیقی کام سامنے آیا ہے، ان میں احقر کی معلومات کی حد تک سب سے زیادہ جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علماء کرام اور ماہرین معاشیات و بنکاری کی مدد سے مرتب کی ہے اور اب منظر عام پر آچکی ہے ـــ اس رپورٹ کا حاصل بھی یہی ہے کہ بلاسود بنکاری کی اصل بنیاد نفع و نقصان کی تقسیم پر قائم ہوگی، اور بینک کا بیشتر کاروبار شرکت یا مضاربت پر مبنی ہو گا، البتہ جن کاموں میں شرکت یا مضاربت کار آمد نہیں ہو سکتی، وہاں کے لئے اس رپورٹ میں کچھ اور متبادل راستے بھی تجویز کئے گئے ہیں جنہیں بوقت ضرورت عبوری دور میں اختیار کیا جا سکتا ہے، انہی متبادل راستوں میں ایک متبادل راستہ وہ ہے جسے اس رپورٹ میں "بیع مؤجل" کا نام دیا گیا ہے۔

اس طریق کار کا خلاصہ اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک کاشتکار ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس رقم نہیں ہے، بحالات موجودہ ا۔ شخص کو بینک سود پر قرض دیتا ہے، یہاں سود کے بجائے شرکت یا مضاربت اس لئے نہیں چل سکتی کہ کاشتکار ٹریکٹر تجارت کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے کھیت میں استعمال کے لئے خریدنا چاہتا ہے ـــ اس صورت حال کا مثالی حل تو یہ ہے کہ بینک ایسے اشخاص کو قرض حسن فراہم کرے، لیکن جب تک بینکوں کی مالی پوزیشن اتنی مستحکم ہو کہ وہ اپنا روپیہ قرض حسن کے طور دے سکیں، اس وقت تک کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بینک کاشتکار کو روپیہ دینے کے بجائے ٹریکٹر خرید کر ادھار قیمت پر دے دے، اور اس کی قیمت اپنا کچھ منافع رکھ کر متعین کرے اور کاشتکار کو اس بات کی مہلت دے کہ وہ بینک کو ٹریکٹر کی مقررہ قیمت کچھ عرصے کے بعد ادا کر دے۔ اس طریقے کو اسلامی کونسل کی رپورٹ میں "بیع مؤجل" کا نام دیا گیا ہے، اور اس میں بینک نے ٹریکٹر کی بازاری قیمت پر جو منافع رکھا ہے اسے معاشی اصطلاح میں "مارک اپ" کہا جاتا ہے۔

یہ سود سے بچاؤ کا کوئی مثالی طریقہ تو نہیں ہے، لیکن چونکہ مذکورہ صورت میں بینک ٹریکٹر کو اپنی ملکیت، اپنے قبضے اور ضمان (Risk) میں لانے کے بعد فروخت کرتا ہے، اس لئے فقہی

اعتبار سے یہ نفع سود نہیں ہوتا، اور فقہائے کرام ؒ نے خاص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ جن مقامات پر بینک کے سامنے فی الحال کوئی متبادل راستہ نہیں ہے، وہاں کونسل کی رپورٹ میں یہ طریق کار اختیار کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، جس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ ضرورت کے مواقع پر صریح سود سے بچنے کے لئے یہ طریق کار اختیار کر لیا جائے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس طریق کار کو سود کی روح باقی رکھنے کا ایک قانونی حیلہ بنا کر بنکاری نظام کی پوری عمارت "مارک اپ" کی بنیاد پر کھڑی کر دی جائے۔ چنانچہ کونسل کی مذکورہ رپورٹ میں جہاں سود کے متبادل طریقوں میں ایک طریقہ "بیع مئوجل" مقرر کیا گیا ہے، وہاں پوری صراحت کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اس طریق کار کو کن حدود میں استعمال کرنا چاہئے۔ رپورٹ کے تمہیدی نکات میں لکھا ہے کہ

"کونسل اس امر کو ابتدا ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں سود کا مثالی متبادل حل، نفع نقصان میں شرکت یا قرض حسن کی صورت میں سرمائے کی فراہمی ہے۔ اگرچہ اس رپورٹ میں پیش کردہ سفارشات بڑی حد تک نفع نقصان میں شرکت کے اصول پر مبنی ہیں، لیکن بعض سفارشات میں کچھ دوسرے متبادل طریقے مثلاً پٹہ داری، ملکیتی کرایہ داری، بیع مئوجل، سرمایہ کاری بذریعہ نیلام بھی اپنائے گئے ہیں .... اگرچہ یہ متبادل طریقے جس صورت میں زیر نظر رپورٹ میں پیش کئے گئے ہیں، سود کے عنصر سے پاک ہیں، تاہم اسلام کے مثالی اقتصادی نظام کے نقطۂ نظر سے یہ صرف "دوسرا متبادل حل" ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ طریقے بالآخر سودی لین دین اور اس سے متعلقہ برائیوں کے از سر نو رواج کے لئے چور دروازے کے طور پر استعمال ہونے لگیں، لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ ان طریقوں کا استعمال کم سے کم حد تک صرف ان صورتوں اور خاص حالات میں کیا جائے جہاں اس کے سوا چارہ نہ ہو، اور اس بات کی ہرگز اجازت نہ دی جائے کہ یہ طریقے سرمایہ کاری کے عام معمول کی حیثیت اختیار کر لیں"۔

(خاتمہ سود پر اسلامی نظریاتی کونسل کی اردو رپورٹ صفحہ ۱۳)

نیز "بیع مؤجل" کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے آگے پھر لکھا ہے کہ

> "اگرچہ اسلامی شریعت کے مطابق سرمایہ کاری کے اس طریقے کا جواز موجود ہے تاہم بلاامتیاز اسے ہر جگہ کام میں لانا دانش مندی سے بعید ہو گا، کیونکہ اس کے بے جا استعمال سے خطرہ ہے کہ سودی لین دین کے از سرنو رواج کے لئے چور دروازہ کھل جائے گا لہٰذا ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ یہ طریقہ صرف ان صورتوں میں استعمال ہو جہاں اس کے سوا چارہ نہ ہو"۔

(ایضاً صفحہ ۲۶ فقرہ ۱/۱۷)

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یکم جنوری سے نافذ ہونے والی اسکیم کا جائزہ لیتے ہیں تو نقشہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اس اسکیم میں نہ صرف یہ کہ "مارک اپ" ہی کو غیر سودی کاؤنٹرز کے کاروبار کی اصل بنیاد قرار دے دیا گیا، بلکہ "مارک اپ" کے طریق کار میں ان شرائط کا بھی لحاظ نظر نہیں آتا جو اس "مارک اپ" کو محدود فقہی جواز عطا کر سکتی تھیں، چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل سنگین خرابیاں نظر آتی ہیں:۔

"بیع مؤجل" کے جواز کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ بائع جو چیز فروخت کر رہا ہے وہ اس کے قبضے میں آچکی ہو، اسلامی شریعت کا یہ معروف اصول ہے کہ جو چیز کسی انسان کے قبضے میں نہ آئی ہو اور جس کا کوئی خطرہ (Risk) انسان نے قبول نہ کیا ہو اسے آگے فروخت کر کے اس پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اور زیر نظر اسکیم میں "فروخت شدہ" چیز کے بینک کے قبضے میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ یہ صراحت کی گئی ہے کہ بینک "مارک اپ اسکیم" کے تحت کوئی چیز مثلاً چاول اپنے گاہک کو فراہم نہیں کرے گا، بلکہ اس کو چاول کی بازاری قیمت دے گا، جس کے ذریعے وہ بازار سے چاول خرید لے گا، اور اسکیم کے الفاظ میں:۔

> "جن اشیاء کے حصول کے لئے بینک کی طرف سے رقم فراہم کی گئی ہے، ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے اپنی فراہم کردہ رقم کے معاوضے میں بازار سے خرید لی ہیں، اور پھر انہیں نوے دن کے بعد واجب الاداء زائد قیمت پر ان اداروں کے ہاتھ فروخت کر

دیا ہے، (جو اس سے رقم لینے آئے ہیں)

(اسٹیٹ بنک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۹)

اس میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ وہ اشیاء بینک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں کب اور کس طرح آئیں گی؟ اور محض کسی شخص کو کوئی رقم دے دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ جو چیز وہ خریدنا چاہ رہا ہے وہ پہلے بینک نے خریدی اور پھر اس کے ہاتھ بیچ دی ہے؟ صرف کاغذ پر کوئی بات فرض کر لینے سے وہ حقیقت کیسے بن سکتی ہے، جب تک اس کا صحیح طریق کار اختیار نہ کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ بینک پہلے اس ادارے کو اپنا وکیل (Agent) بنائے کہ وہ مطلوبہ چیز بینک کی طرف سے خرید لے، اور جب وہ خرید کر بینک کے وکیل کی حیثیت سے اس پر قبضہ کر لے تو پھر بینک اسے فروخت کر دے، لیکن اول تو اس طریق کار کی صراحت ہونی چاہئے، دوسرے یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ جب تک وہ ادارہ مطلوبہ چیز خرید کر اس پر بینک کی طرف سے قبضہ نہیں کرے گا۔ بینک کی فراہم کی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض نہیں، بلکہ اس کے پاس بینک کی امانت ہو گی۔ یہاں نہ صرف یہ کہ اس قسم کے کسی طریق کار کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ۲۸ مارچ کو چاول وغیرہ کی خریداری کے لئے بینکوں نے جو رقمیں رائس کارپوریشن کو پہلے سے دی ہوئی تھیں، ۲۸ مارچ کو یہ سمجھا جائے گا کہ کارپوریشن نے وہ رقمیں سود کے ساتھ بینک کو واپس کر دی ہیں، اور پھر بینک نے اسی روز وہ رقمیں دوبارہ کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر دے دی ہیں، اور جس جنس کی خریداری کے لئے وہ قرضے دیئے گئے تھے، یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے خرید لی ہے، اور پھر کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر بیچ دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ جن رقموں سے کارپوریشن پہلے چاول وغیرہ خرید چکی ہے اور شاید خرید کر آگے فروخت بھی کر چکی ہے اس کے بارے میں کون سی منطق کی رو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بینک نے خرید کر دوبارہ کارپوریشن کو بیچی ہے؟

اس سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ "بیع مؤجل" کا طریقہ حقیقی طور پر اپنانا پیش نظر نہیں بلکہ فرضی طور پر اس کا صرف نام لینا پیش نظر ہے، اور انتہا یہ ہے کہ اس جگہ یہ نام بھی برقرار نہیں رہ سکا، بلکہ بینک کی دی ہوئی رقم کو قرض (Advance) اور اس عمل کو قرض دینے (Lend) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(اسٹیٹ بینک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۷)

اس اسکیم کی ایک سنگین ترین غلطی اور ہے۔ "بیع مؤجل" کے لئے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ معاہدے کے وقت فروخت شدہ شے کی قیمت بھی واضح طور پر متعین ہو جائے، اور یہ بات بھی کہ یہ قیمت کتنی مدت میں ادا کی جائے گی؟ پھر اگر خریدنے والا وہ قیمت معینہ مدت پر ادا نہ کرے تو اس سے وصول کرنے کے لئے تمام قانونی طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں، لیکن ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر معینہ قیمت میں اضافہ کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ تاخیر کی بنیاد پر قیمت میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو اسی کا دوسرا نام سود ہے، لیکن زیر نظر اسکیم میں اس اہم اور بنیادی شرط کی بھی نہ صرف یہ کہ پابندی نہیں کی گئی بلکہ بعض معاملات میں وضاحت کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، چنانچہ اس میں کہا گیا ہے کہ امپورٹ بلوں کی ادائیگی میں بینک جو رقم خرچ کرے گا، اس پر ابتداءً بیس دن کی مدت کے لئے اعشاریہ ۸۷ فی صد مارک اپ وصول کرے گا، اور اگر یہ رقم بیس دن میں ادا نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید چودہ دن کے لئے اعشاریہ ۵۸ فیصد مارک اپ کا مزید اضافہ ہو گا اور اگر ۳۴ دن گزر جانے پر بھی قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید اعشاریہ ۶۲ فیصد مارک اپ کا اضافہ ہو گا، اور اگر ۴۸ دن گزر جانے پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو آئندہ ہر پندرہ دن کی تاخیر پر مزید اعشاریہ ۹۷ فیصد کے مارک اپ کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اندازہ فرمایئے کہ یہ طریق کار واضح طور پر سود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر "انٹرسٹ" کے بجائے نام "مارک اپ" رکھ دیا جائے اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں تو اس سے "غیر سودی نظام" کیسے قائم ہو جائے گا؟

یہ غنیمت ہے کہ مدتوں کے اضافے سے مارک اپ کی شرحوں میں اضافہ زیر نظر اسکیم میں صرف امپورٹ بلوں کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، دوسرے معاملات میں اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ لیکن اگر یہ صورت مجوزین اسکیم کی نظر میں "غیر سودی" ہے تو شاید وہ دوسرے معاملات میں بھی اس کے اطلاق میں کوئی قباحت نہ سمجھیں۔

۳۔ ملکی ہنڈیوں اور بلز آف ایکسچینج کو بھنانے کے لئے جو طریقہ اسکیم میں تجویز کیا گیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو آج کل بنکوں میں رائج ہے، اس میں سرمو کوئی فرق نہیں کیا گیا، صرف اس کٹوتی کو جو پہلے کٹوتی (Discount) کہلاتی تھی، "مارک ڈاؤن" کا نام دے دیا گیا ہے، حالانکہ ہنڈیاں بھنانے کے لئے بھی ایک شرعی طریق کار اسلامی کونسل کی رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے۔

۴۔ پھر اگر بالفرض اسکیم سے یہ شرعی قباحتیں دور کر دی جائیں تب بھی اصولی مسئلہ یہ ہے کہ اس اسکیم میں شرکت اور مضاربت کو غیر سودی بنکاری کی اصلی اساس قرار دینے کے بجائے، مارک اپ کو اسکیم کی اصل بنیاد قرار دیا گیا ہے، اور غیر سودی کاؤنٹرز کا بیشتر کاروبار اسی قانونی حیلے کے گرد گھما دیا گیا ہے۔ اس وقت اسٹیٹ بنک آف پاکستان سے جاری ہونے والا پندرہ روزہ اخبار "اسٹیٹ بینک نیوز" ہمارے سامنے ہے، اس کے یکم جنوری ۱۹۸۱ء کے شمارے میں ان مدات اور اس طریق کار کی تفصیل دی گئی ہے جو غیر سودی کاؤنٹرز میں اختیار کیا گیا ہے، اس تفصیل کے مطابق غیر سودی کاؤنٹرز میں جمع ہونے والی رقوم سات مختلف مدات میں استعمال کی جائیں گی، ان سات مدات میں سے صرف ایک مد میں شرکت یا مضاربت کے طریقے کو استعمال کیا گیا ہے، اور باقی تمام مدات میں "مارک اپ" یا "مارک ڈاؤن" کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے اور شرکت یا مضاربت والی مد کو استعمال کرنے کے لئے بھی کوئی نیا طریق کار وضع کرنے کے بجائے یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ رقم مختلف کمپنیوں کے حصص، این آئی ٹی یونٹس اور پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ خریدنے اور انویسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان اور بینکرز ایکویٹی کے ان معاملات میں استعمال کی جائے گی جو نفع و نقصان کی شرکت پر مبنی ہیں۔

اس طریق کار کا حاصل یہ ہے کہ ملک میں شرکت و مضاربت کے دائرے کو توسیع دینے کا کوئی پروگرام پیش نظر نہیں ہے، بلکہ جو ادارے اس وقت شرکت یا مضاربت کے طریقے پر کام کر رہے ہیں، غیر سودی کاؤنٹروں کی جتنی رقم ان اداروں میں لگ سکے گی وہ ان میں لگا دی جائے گی، اور باقی سارا کاروبار "مارک اپ" کی بنیاد پر ہو گا۔ اور معاملہ یہ نہیں ہو گا کہ بینک کا اصل کاروبار شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر ہو، اور جزوی طور پر ضرورت کے وقت "مارک اپ" کا طریقہ اختیار کیا جائے بلکہ "مارک اپ" کاروبار کی اصل بنیاد ہو گا اور جزوی طور پر شرکت یا مضاربت کے طریقے کو بھی اختیار کر لیا جائے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ بینکاری کے نظام کو بدل کر اسے مثالی اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے کے بجائے چند حیلوں کے سہارے موجودہ نظام جوں کا توں باقی رہے گا۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر "بیع مؤجل" کا مذکورہ بالا طریقہ شرعاً جائز ہے اور اسے بعض مقامات پر اختیار کیا جا سکتا ہے تو پھر پورے نظام بینکاری کو اس کی بنیاد پر چلانے میں کیا قباحت ہے؟ اور اس کے جائز ہونے کے باوجود شرکت یا مضاربت ہی پر کیوں زور دیا جا رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "بیع مؤجل" کا مذکورہ طریقہ جس میں کسی چیز کو ادھار بیچنے کی صورت میں اس کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، اگرچہ ٹھیٹھ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے سود میں داخل نہیں ہوتا، لیکن اس کے رواج عام سے سود خور ذہنیت کی حوصلہ افزائی ہو سکتی ہے، اس لئے یہ کوئی پسندیدہ طریق کار نہیں ہے، اور اس کو پورے نظام بنکاری کی بنیاد بنالینا مندرجہ ذیل وجوہ سے درست نہیں ہے:۔

ا۔ ادھار بیچنے کی صورت میں قیمت بڑھا دینا خود فقہاء کرام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، اگرچہ اکثر فقہاء اسے جائز کہتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں مدت بڑھنے کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کی جاتی ہے، اور اس طرح، خواہ یہ ٹھیٹھ معنی میں سود نہ ہو، لیکن اس میں سود کی مشابہت یا سود کی خود غرضانہ ذہنیت ضرور موجود ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اسے ناجائز بھی قرار دیا ہے، چنانچہ قاضی خان جیسے محقق حنفی عالم اسے سود کے حکم میں شامل کر کے اسے حرام کہتے ہیں۔

اور ایسا معاملہ جس کے جواز میں فقہاء کرام کا اختلاف ہو، اور جس میں سود کی کم از کم مشابہت تو پائی ہی جاتی ہو، اسے شدید ضرورت کے مواقع پر بدرجہ مجبوری اختیار کر لینے کی تو گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس پر اربوں روپے کی سرمایہ کاری کی بنیاد کھڑی کر دینا اور اسے سرمایہ کاری کا ایک عام معمول بنالینا کسی طرح درست نہیں۔

۲۔ بینک بنیادی طور پر کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد تجارت، صنعت اور زراعت میں سرمائے کی فراہمی ہوتا ہے، اگر ایک تجارتی ادارہ جو تجارت ہی کی غرض سے وجود میں آیا ہو اور جس کے پاس سامان تجارت موجود رہتا ہو وہ "بیع مؤجل" کا مذکورہ طریقہ اختیار کرے تو اس کی نوعیت مختلف ہے، لیکن بینک جو نہ تجارتی ادارہ ہے اور نہ سامان تجارت اس کے پاس موجود رہتا ہے، وہ "بیع مؤجل" کا یہ طریقہ اختیار کرے تو ایک کاغذی کارروائی کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی، جس کا مقصد سود سے بچنے کے ایک حیلے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس قسم کے حیلوں کی شدید ضرورت کے مواقع پر تو گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن سارا کاروبار ہی حیلہ سازی پر مبنی کر دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

(۳)۔ جب ہم "غیر سودی بنکاری" کا نام لیتے ہیں اور بینکنگ کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کی بات کرتے ہیں تو اس کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ چند حیلوں کے ذریعے ہم موجودہ طریق کار کو ذرا سا تبدیل کر کے سارا نظام جوں کا توں برقرار رکھیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے

کہ سرمایہ کاری کے پورے نظام کو تبدیل کر کے اسے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالیں، جس کے اثرات تقسیم دولت کے نظام پر بھی مرتب ہوں اور سرمایہ کاری کا اسلامی تصور یہ ہے کہ جو شخص کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کر رہا ہے وہ یا نفع کا مطالبہ نہ کرے، یا اگر نفع کا مطالبہ کرتا ہے تو نقصان کے خطرے میں بھی شریک ہو، لہٰذا "غیر سودی بنکاری" میں بنیادی طور پر اس تصور کا تحفظ ضروری ہے، اب اگر بینک کا سارا نظام "مارک اپ" کی بنیاد پر استوار کر لیا جائے تو سرمایہ کاری کا یہ بنیادی اسلامی تصور آخر کہاں اطلاق پذیر ہو گا؟ کیا ہم دنیا کو یہی باور کرائیں گے کہ مروجہ بنکنگ سسٹم کی خرابیوں پر پورے عالم اسلام میں جو شور مچ رہا تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ "انٹرسٹ" کے بجائے مارک اپ کا حیلہ کیوں استعمال نہیں کیا جا رہا؟ کیا اس حیلے کے ذریعے نظام تقسیم دولت کی مروجہ خرابیوں کا کوئی ہزارواں حصہ بھی کم ہو سکے گا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خدارا سوچئے کہ "مارک اپ" کا حیلہ استعمال کر کے ہم اسلامی نظام سرمایہ کاری کا کیا تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں؟

اسی لئے ہمارے فقہاء کرامؒ نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ اکا دکا مواقع پر کسی قانونی تنگی کو دور کرنے کے لئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کر لینے کی تو گنجائش ہے، لیکن ایسی حیلہ سازی جس سے مقاصد شریعت فوت ہوتے ہوں، اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو جس قسم کا نظام سرمایہ کاری مطلوب ہے وہ "مارک اپ" کے "میک اپ" سے حاصل نہیں ہو گا، اس کے لئے محض قانونی لیپ پوت کی نہیں، انقلابی فکر کی ضرورت ہے، اس غرض کے لئے کاروباری اداروں کو مجبور کرنا ہو گا کہ وہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر کام کریں، حسابات رکھنے کے طریقے بدلنے ہوں گے، ٹیکسوں اور بالخصوص انکم ٹیکس کے موجودہ قوانین کی ایسی اصلاح کرنی ہو گی جس سے یہ قوانین بددیانتی اور رشوت ستانی کی دعوت دینے کے بجائے لوگوں میں امانت و دیانت اور ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ پیدا کریں، اور سب سے بڑھ کر اس ذہنیت کا خاتمہ کرنا ہو گا جو نقصان کا ادنیٰ خطرہ مول لئے بغیر اپنے ایک ایک روپے پر یقینی نفع کی طلب گار ہوتی ہے۔

لہٰذا ہم ارباب حکومت سے نہایت دردمندی کے ساتھ یہ اپیل کرتے ہیں کہ جب آپ نے معیشت کو سود سے پاک کرنے کا مبارک ارادہ کیا ہے ـــــ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس ارادے کی نیک نیتی پر شبہ کیا جائے ـــــ اور جب آپ اس سمت میں عملی اقدام بھی کرنے کے لئے تیار ہیں تو خدا کے لئے یہ کام نیم دلی سے نہ کیجئے، کیونکہ اس قسم کے انقلابی کاموں میں نیم دلی

بعض اوقات انتہائی خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے بجائے آپ پوری جرأت و ہمت اور پوری یکسوئی کے ساتھ وہ اقدامات کیجئے جو اس عظیم اور مقدس کام کے لئے ضروری ہیں۔ ابھی غیر سودی کاؤنٹروں کی محض ابتدا ہے اور اس مرحلے پر خرابیوں کی اصلاح نسبتاً آسان ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی جائیں گی، چنانچہ ہماری نظر میں فوری طور سے کرنے کے کام یہ ہیں:۔

(۱) ۔ غیر سودی کاروبار کی اصل بنیاد "مارک اپ" کے بجائے نفع و نقصان کی تقسیم کو بنایا جائے۔

(۲) ۔ جن مقامات پر "مارک اپ" کا طریقہ باقی رکھنا ناگزیر ہو وہاں اس کی شرعی شرائط پوری کی جائیں، یعنی اول تو قیمت کی ادائیگی میں تاخیر پر "مارک اپ" کی شرحوں میں اضافے کی شرط کو فی الفور ختم کیا جائے، کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ "مارک اپ" کی بنیاد پر فروخت کیا جانے والا سامان بینک کے قبضے میں لاکر فروخت کیا جائے گا۔

(۳) ۔ بل آف ایکسچینج بھنانے کے لئے "مارک ڈاؤن" کا طریقہ ختم کر کے وہ طریق کار اختیار کیا جائے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا ہے۔

(۴) ۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اب تک "غیر سودی کاؤنٹر" میں رقم رکھوانے والوں کو یہ نہیں بتایا گیا کہ منافع کی صورت میں ان کو ملنے والی شرح منافع کیا ہوگی؟ یعنی یہ واضح نہیں ہے کہ بینک نفع کا کتنا حصہ خود رکھے گا اور کتنا اکاؤنٹ ہولڈرز میں تقسیم کرے گا؟ اس کے بجائے غیر سودی کاؤنٹر کے پراسپکٹس میں یہ کہا گیا ہے کہ شرح کا تعین کلی طور پر بینک کی صواب دید پر ہوگا یہ صورت حال بھی شرعاً درست نہیں۔ جب اکاؤنٹ ہولڈرز کے ساتھ شرکت کا معاملہ کیا جارہا ہے تو یہ بات معاہدے کے وقت طے ہونی چاہئے کہ نفع کی صوت میں نفع کا کتنا متناسب حصہ بینک کا ہوگا اور کتنا اکاؤنٹ ہولڈر کا؟ ورنہ شرح منافع مجہول ہونے کی بنا پر اس معاملے کی شرعی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ جن حضرات نے اس نئے نظام کے تحت "غیر سودی کاؤنٹروں" میں اپنے اکاؤنٹ کھلوائے ہیں، ان کو ملنے والے نفع کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ نیز جن حضرات کو

اللہ تعالیٰ نے سود سے بچنے کی توفیق بخشی ہے، وہ آئندہ ان کاؤنٹروں میں رقم رکھوائیں یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ "غیر سودی کاؤنٹروں" کے کاروبار کی جو تفصیل ہم نے دیکھی ہے اس کی رو سے اس کاروبار کے تین حصے ہیں:۔

(۱) پہلا حصہ واضح طور پر جائز ہے یعنی جو رقمیں عام کمپنیوں کے غیر ترجیحی حصص یا این آئی ٹی یونٹ خریدنے میں لگائی جائیں گی یا کسی اور ایسے کاروبار میں لگائی جائیں گی جو شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر رقمیں وصول کرتا ہو، ان پر حاصل ہونے والا منافع شرعاً حلال ہو گا۔

(۲)۔ دوسرا حصہ واضح طور پر ناجائز ہے۔ یعنی درآمدی بلوں پر "مارک اپ" کا جو طریقہ اسکیم میں بتایا گیا ہے کہ وقت مقررہ پر ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں "مارک اپ" کی شرح بڑھتی چلی جائے گی یہ واضح طور پر شرعاً ناجائز ہے، اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والا منافع شرعاً حلال نہیں ہو گا، اسی طرح ملکی بلوں پر "مارک ڈاؤن" کے نام سے کٹوتی کر کے جو نفع حاصل ہو گا، وہ بھی شرعاً درست نہیں ہو گا۔

(۳)۔ تیسرا حصہ مبہم اور غیر واضح ہے۔ یعنی درآمدی بلوں کے علاوہ دوسری مدات میں جہاں "مارک اپ" کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہاں صورت حال پوری طرح واضح نہیں، وہاں بھی نفع کے ناجائز ہونے کے دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہاں بھی ادائیگی میں تاخیر ہونے پر "مارک اپ" کی شرح بڑھائی جاتی رہے، جس کی اسکیم میں نہ کوئی صراحت ہے نہ تردید۔ اور دوسرے یہ کہ بینک جو سامان "مارک اپ" کی بنیاد پر فروخت کر رہا ہے، اس پر بینک کا قبضہ ہونے سے پہلے اسے فروخت کر دیا جائے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی صورت نہ ہوئی تو فقہی طور پر اس سے حاصل ہونے والے نفع کی گنجائش ہو گی۔

اس تجزیئے سے یہ بات واضح ہوئی کہ فی الحال ان "غیر سودی کاؤنٹروں" کا کاروبار جائز اور ناجائز معاملات سے مخلوط ہے، اور اس کا کچھ حصہ مشتبہ ہے۔ لہٰذا جب تک ان خامیوں کی اصلاح نہ ہو، اس سے حاصل ہونے والے منافع کو کلی طور پر حلال نہیں کہا جا سکتا، اور مسلمانوں کو ایسے کاروبار میں حصہ لینا درست نہیں۔

یہ تو تھا نئے نظام کا علمی جائزہ اور اس سلسلے میں عملی تجاویز کا خاکہ!

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "غیر سودی بینکاری" کے نام پر یہ غیر شرعی کاروبار

کر کے عام مسلمان کو دھوکے میں رکھنے کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ جب حکومت کی طرف سے واضح طور پر بار بار یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ وہ تین سال کے اندر ملکی معیشت کو سود سے پاک کرنے کی پابند ہے، اور اس غرض کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل اور اس کے مرتب کردہ پینل نے سال بھر کی عرق ریزی کے بعد ایک مفصل رپورٹ حکومت کو دے دی ہے اور وہ شائع بھی ہو چکی ہے تو کسی فرد یا محکمے کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اس رپورٹ کے مندرجات کو پس پشت ڈال کر اپنی ذاتی رائے سے ایک ایسا نظام وضع کرے جو شرعی احکام کے خلاف ہے، اور جسے "غیر سودی بنکاری" کا نام دینا عام مسلمانوں کو فریب دینے کے مترادف ہے؟

ہم صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے کی طرف فوری توجہ دے کر نہ صرف اس کی غلطیوں کی اصلاح کریں، بلکہ اس بات کی تحقیق کرائیں کہ اس غلطی کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ اور وہ کون سے عناصر ہیں جو نفاذ شریعت کے ہر اقدام میں رکاوٹ ڈالنے اور مسخ کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ایسے عناصر کی ریشہ دوانیوں پر صبر وتحمل کا مظاہرہ بہت کچھ ہو چکا اب وقت آگیا ہے کہ ان باتوں کا نوٹس لیا جائے، اور عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہونے سے پہلے ملک کو ان سے نجات دلائی جائے، ورنہ عام بے چینی پیدا کرنے والے ایسے اقدامات کا نتیجہ ملک وملت اور خود حکومت کے لئے کبھی اچھا نہیں ہو سکتا ــــ اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب بست وکشاد کو یہ توفیق عطا فرمائیں، کہ وہ اس نئے نظام کو تمام غیر شرعی امور سے کلی طور پر پاک کرنے کی فکر کریں، تاکہ مسلمان پوری یکسوئی دلجوئی اور اطمینان خاطر کے ساتھ غیر سودی بینکاری کو کامیاب بنانے میں حصہ لے سکیں۔ آمین

آخر میں ہم ملک کے ان علماء سے جو خاص طور پر فقہ میں بصیرت رکھتے ہیں، یہ گزارش کرتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ غیر سودی بنکاری کے سلسلے میں شائع کی ہے، اس کا بنظر غائر مطالعہ فرما کر اس کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں، ظاہر ہے کہ یہ رپورٹ اس معاملے میں حرف آخر نہیں ہے، اس میں اب بھی علمی وفقہی خامیاں ہو سکتی ہیں، اور اس کی اشاعت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اہل علم کی مدد سے اسے بہتر سے بہتر بنایا جا سکے، اس لئے یہ علماء کا فریضہ ہے کہ اس کا جائزہ لے کر ضروری ہو تو اس میں اصلاحات تجویز فرمائیں، تاکہ یہ علمی کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے، اور پھر اس کے نفاذ کی عملی جدوجہد آسان ہو جائے۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۱۸ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ

ذکر و فکر

بچت کا ہفتہ اور حکومت کی مالی اسکیمیں

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا
اور
درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

حکومت نے ۱۵ مئی سے ۲۰ مئی تک ملک بھر میں بچت کا ہفتہ منانے کا اعلان کیا ہے، اس موقع پر محترم صدر مملکت نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ "ہفتہ بچت" کا بنیادی مقصد ہمیں اپنی اس اخلاقی اور قومی ذمہ داری کا احساس دلانا ہے کہ ہم اپنی آمدنی کا ایک حصہ قومی بچت کی اسکیموں میں لگانے کے لیئے علیحدہ رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا دارو مدار باقاعدہ ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری پر ہے، جبکہ ترقیاتی منصوبہ بندی کا انحصار فنڈ کی دستیابی پر ہے۔ چنانچہ ہر انفرادی بچت ملک کی اقتصادی ترقی میں تعمیری کردار ادا کرتی ہے۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قومی ترقی کی ضروریات پوری کرنے کے لیئے ہم جس قدر زیادہ اپنے ملکی وسائل کو استعمال میں لائیں گے اسی قدر غیر ملکی امداد پر ہمارا انحصار کم ہوتا جائے گا۔ اس لیئے ہر شخص کو عہد کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی تمام کی تمام آمدنی خرچ کرنے کے بجائے اس کا ایک حصہ قومی بچت کی اسکیموں میں لگائے گا۔

محترم وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان صاحب نے بھی اس موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ کوئی بھی ملک سخت محنت اور کفایت شعاری کے بغیر ترقی کے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بچت کی شرح دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، جس کے نتیجے میں ہمیں سرمائے اور سرمایہ کاری کی ضروریات پوری کرنے کے لیئے غیر ملکی وسائل پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیئے ہر شخص کا یہ اسلامی فرض ہے،

اور حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرے، اور تھوڑی بہت جو بھی بچت کر سکتا ہے کرے۔ وفاقی وزیر خزانہ نے اندرون اور بیرون ملک پاکستانیوں سے اپیل کی کہ وہ "ہفتہ بچت" کو کامیاب کرنے کے لئے قومی بچت کی مختلف اسکیموں میں سرمایہ کاری کریں۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۱۵ مئی ۱۹۸۲ء)

پاکستان کے عوام کو بچت کی ترغیب اور سادگی اختیار کرنے کی تلقین اس سے پہلے بھی مختلف حکومتوں کی طرف سے ہوتی رہی ہے. لیکن موجودہ حکومت کی طرف سے یہ اپیل اس لحاظ سے بطور خاص قابل غور ہے کہ وہ ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی داعی ہے۔ اور اس کے یہ متواتر اعلانات کسی سے مخفی نہیں کہ وہ سیاست، معیشت، معاشرت، قانون، غرض ہر شعبہ زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے، اس سمت میں اس نے کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں، اور وہ ترجیحات کی فہرست میں اس مقصد کو اولین اہمیت دیتی ہے چنانچہ محترم وزیر خزانہ نے اپنے پیغام میں صراحۃً بھی اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ عوام کا "اسلامی فرض" ہے کہ وہ سادہ زندگی اختیار کر کے جتنی بچت کر سکتے ہوں، کریں، اور قومی بچت کی مختلف اسکیموں میں سرمایہ لگائیں۔

"بچت" کے بارے میں اسلامی احکام اور تعلیمات پر ایک مفصل مقالے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اس وقت یہ موضوع ہمارے پیش نظر نہیں اس وقت ہم اپنے ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں اس موضوع پر چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک سادہ زندگی اختیار کرنے، فضول خرچی سے بچنے، اور بچت کو قومی کاموں میں لگانے کا تعلق ہے، ان مقاصد سے شاید کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس مسئلے کے کچھ دینی اور عملی پہلو ایسے ہیں کہ ان کی طرف توجہ دیئے بغیر یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے، اور ان کے بغیر بچت کی اسکیموں میں سرمایہ کاری کی ترغیب کو اسلام کی طرف منسوب کرنا لاتقربو الصلوٰۃ کے لطیفے سے کم نہیں۔ آج کی محفل میں ہم انہی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں:

حکومت کی توجہ کے لئے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کو سادہ زندگی اور بچت کی تلقین اس وقت تک محض ایک لفظی وعظ کی طرح بے اثر رہے گی جب تک حکومت اپنی معاشی

پالیسیوں اور اپنے طرز عمل کے ذریعہ اس کے لئے مناسب فضا پیدا نہ کرے۔ آج حال یہ ہے کہ عوام جب اونچے درجے کے سرکاری افسروں اور وزراء کے انداز زندگی کامشاہدہ کرتے ہیں تو دور دور سادگی کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آتی، دوسری طرف سامان تعیش کے سلسلے میں حکومت کی فراخ ولانہ پالیسیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں تعیشات کے حصول کی دوڑ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور ملک کی مجموعی فضا ایسی بن گئی ہے کہ جب تک کسی شخص کے گھر میں ٹیلی ویژن، وی سی آر، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر اور اس جیسی اشیاء نہ ہوں اس وقت تک وہ اپنے آپ کو پسماندہ اور محروم سمجھتا ہے، اور یہ احساس محرومی اسے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ ملک کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنی روزمرہ کی ضروریات ہی بمشکل پوری کر پاتے ہیں، اور اگر کچھ بچت کر بھی سکتے ہیں تو وہ سامان تعیش کی اس دوڑ کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں بچت میں اضافہ ہو تو کس طرح ہو؟

دوسرا مسئلہ جس کی طرف ہمیں اس وقت خاص طور پر توجہ دلانی ہے، یہ ہے کہ آپ کا یہ ارشاد تو بجا ہے کہ سادہ زندگی اختیار کرنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، یہ بات بھی درست ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کرنا حب الوطنی کا تقاضا ہے، لیکن کیا یہ حکومت کا "اسلامی فریضہ" نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو قومی سرمایہ کاری کے لئے ایسے راستے فراہم کرے جن کے ذریعے وہ سود کی لعنت میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی بچت کو ملکی ترقی کے کاموں میں لگا سکیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے "اسلامی فریضہ" پر عمل کرتے ہوئے سادہ زندگی اختیار کرتا ہے اور اپنی بچت کو قومی سرمایہ کاری کی اسکیموں میں لگانا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کیا راستہ ہے کہ وہ حکومت کی جاری کی ہوئی سودی اسکیموں میں حصہ لے اور سود کی لعنت میں ملوث ہو؟ ان حالات میں بچت کی ترغیب اور اس کو سرمایہ کاری میں لگانے کی تلقین بالواسطہ طور پر سودی کاروبار میں حصہ لینے کی تلقین نہیں تو اور کیا ہے؟ اندازہ فرمائیے کہ کیا اس تلقین کو "اسلامی فریضہ" کے ساتھ منسلک کرنا بالکل ایسا ہی سنگین استدلال نہیں جیسے کسی شخص نے وانتم سکاریٰ کو چھوڑ کر صرف لاتقربوا الصلوٰۃ سے یہ استدلال کیا تھا کہ نماز کے قریب پھٹکنا جائز نہیں۔

موجودہ حکومت اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہے کہ اس نے سود کی حرمت اور اس کی خرابیوں کا نہ صرف برملا اعتراف کیا ہے، بلکہ اپنے اس ارادے کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ ملکی

معیشت کو اس نجاست سے پاک کرنا چاہتی ہے، اور اس غرض کے لئے اس نے ملک میں دو ایک غیر سودی مالیاتی ادارے قائم کرنے کا اعلان بھی کیا ہے، جبکہ اس سے پہلے کی حکومتیں سود کی برائی ہی کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتی رہی ہیں، بلکہ بعض مرتبہ اس کو حلال طیب ثابت کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ان تمام اعلانات کے باوجود اس سمت میں موجودہ حکومت کی طرف سے عملی پیش رفت میں اب تک جس ست رفتاری اور بے اعتنائی کا مظاہرہ ہوا ہے وہ بڑا مایوس کن ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۷۹ء میں موجودہ حکومت نے تین مالیاتی اداروں (این آئی ٹی۔ آئی سی پی میوچل فنڈ اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن) کو سود سے پاک کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت تصور یہ تھا کہ یہ محض ایک ابتدا ہے، اور اب رفتہ رفتہ ملک کے تمام مالیاتی اداروں کو سود سے پاک کر دیا جائے گا، لیکن آج اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں، اور اب تک اس سمت میں نہ صرف یہ کہ کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ جن تین اداروں کو سود سے پاک کرنے کا اعلان کیا گیا تھا ان میں سے بعض کے بارے میں اب بھی اس قسم کی خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ ان کے کاروبار کا کچھ حصہ اب تک سود میں ملوث ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام علماء اور ماہرین معیشت د بنکاری کی ایک ممتاز جماعت نے انتہائی عرق ریزی کے بعد غیر سودی بنکاری کا مفصل طریق کار اپنی ایک جامع رپورٹ میں تجویز کر دیا ہے، یہ رپورٹ شائع بھی ہو چکی ہے، لیکن اس واقعے کو بھی تقریباً دو سال ہونے والے ہیں، اور اب تک اس رپورٹ پر کوئی مزید کارروائی نہیں ہوئی۔ اسی دوران حکومت کی طرف سے بنکوں میں "نفع نقصان کی شرکت کے کھاتے" کھول کر یہ اعلان کیا گیا کہ ان کے ذریعے تمام بنکوں میں غیر سودی بنکاری کا آغاز کر دیا گیا ہے، لیکن ہم "البلاغ" میں پہلے تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ ان کھاتوں کا طریق کار شریعت کے مطابق نہیں ہے، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کے بھی بالکل خلاف ہے جس کا اظہار خود کونسل کے چیئرمین کی طرف سے بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ کھاتے اب تک جوں کے توں کام کر رہے ہیں، انہیں "غیر سودی بنکاری" کا نام بھی دیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں لوگ ایک غیر شرعی کاروبار کو شرعی سمجھ کر اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ جو ادارے سرکاری طور پر اپنا روپیہ غیر سودی کاروبار میں لگانے کے پابند ہیں، وہ بھی ان کھاتوں سے پرہیز نہیں کرتے، چنانچہ این آئی ٹی اور آئی سی پی کے بارے

میں اطلاعات ملی ہیں کہ ان کی رقموں کا ایک حصہ ان کھاتوں میں بھی جمع ہے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ حکومت کو اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز پر عملی نقطہ نظر سے کچھ اشکالات ہیں، اس لئے ابھی تک ان پر عمل شروع نہیں کیا جا سکا، لیکن اس قسم کے اشکالات کو رفع کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کونسل، وزارت خزانہ، اور متعلقہ اداروں کے ماہرین یکجا بیٹھ کر ان اشکالات پر غور کرتے، اور مل جل کر ان کا کوئی حل نکالتے۔ لیکن کونسل کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد سے آج تک اس قسم کی کوئی کوشش منظر عام پر نہیں آئی۔ جب کہ اس واقعے کو اب دو سال ہونے والے ہیں۔

"سود" جیسے سنگین معاملے میں اس بے اعتنائی اور سہل انگاری کے باوجود محترم وزیر خزانہ کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ "اسلامی فریضہ" کا حوالہ دے کر عوام کو قومی سرمایہ کاری میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔

سود کی حرمت کے اعتراف اور اس کی خرابیوں کے برملا اظہار کے باوجود اب تک اس سمت میں موثر پیش قدمی نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے نہ کوئی واضح منصوبہ حکومت کے ذہن میں ہے، اور نہ اس مقصد کی تکمیل ایسے افراد کے حوالے کی گئی ہے جو مقصدیت کے جذبے سے اس کام کو انجام دے سکیں۔ چنانچہ نظر ایسا آتا ہے کہ جن حضرات کے ہاتھ میں حکومت کی مالی اسکیموں کی باگ ڈور ہے، وہ حکومت کے اعلانات کی پیچ بھرنے کے لئے کچھ متفرق اور سطحی اقدامات کر کے خاموش ہو گئے ہیں، نہ اس سمت میں آگے بڑھنے کا کوئی منصوبہ انہوں نے بنایا ہے، اور نہ کبھی پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ جن شعبوں کو سود سے پاک کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، وہاں اب عملاً کیا ہو رہا ہے؟

ہم انتہائی دردمندی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنے طرز عمل پر نظرثانی کرے۔ اس حکومت نے اپنے آپ کو نفاذ شریعت کے حوالے سے دنیا میں متعارف کرایا ہے اور بارہا اپنی سیاست و معیشت اور قانون کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کا عہد کیا ہے۔ لہٰذا اس پر یہ فریضہ سب سے زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان وعدوں کو ایفا کرے۔ یوں بھی اس حکومت نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو اس بات کا دستوری طور پر پابند کیا ہے کہ وہ تین سال کی مدت کے اندر اندر اپنے مالیاتی قوانین کو سود سے پاک کر

دے گی، ان تین سالوں میں سے دو سال اب گزر چکے ہیں اور صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے۔ لہٰذا حکومت پر دینی، اخلاقی، دستوری ہر اعتبار سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آئندہ سال کے اندر اندر اپنے تمام مالی قوانین کو سود سے پاک کر دے۔

یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اس مقصد کے لئے ایسے افراد منتخب کرے جو معاشی اور مالیاتی امور میں مہارت و بصیرت کے ساتھ اسلامی جذبے سے بھی پوری طرح سرشار ہوں، اور اپنی زندگی کے اہم مقصد کے طور پر ملک کو سود کی لعنت سے نجات دلانے کا تہیہ کئے ہوئے ہوں۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز میں کوئی عملی اشکال نظر آتا ہو تو علماء اور ماہرین معاشیات کی مدد سے اس کا ایسا حل نکالیں جو شریعت کے مطابق ہو، جن اداروں سے سود ختم کیا جائے ان پر پوری نگرانی رکھیں کہ وہ اپنا کاروبار کس طرح چلا رہے ہیں؟ جب تک اس غرض کے لئے ایسے باہمت، بلند حوصلہ اور مقصدیت سے سرشار افراد اس کام کے لئے منتخب نہ کئے جائیں گے، ہماری معاشی زندگی کا یہ سنگین مسئلہ بدستور کھٹائی میں پڑا رہے گا۔ اور یہ قوم جو پینتیس سال سے پرفریب نعروں اور وعدوں کا شکار رہی ہے موجودہ حکومت کے وعدوں سے بھی مایوس ہو جائے گی، اور جو قوم اپنی حکومت سے مایوس ہو جائے، اس سے ملک کی تعمیر و ترقی میں تعاون کی امید رکھنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب اقتدار کو اس حقیقت کا صحیح فہم اور اس پر جرات مندی کے ساتھ عمل کا حوصلہ عطا فرمائیں، اور انہیں ان وعدوں کی تکمیل کی توفیق بخشیں، جن کا ایفاء ان کے وجود کی واحد وجہ جواز ہے۔

و ما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

ذکر و فکر

مشارکہ کی نئی اسکیم

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا
اور
درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

موجودہ حکومت نے بر سر اقتدار آنے کے بعد بار بار اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ وہ ملکی نظام معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرنا چاہتی ہے۔ اسی سلسلے میں حکومت کی طرف سے اس حقیقت کا بھی برملا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہمارے موجودہ نظام معیشت کی بنیادی خرابی جو پوری معیشت کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے، سود کی لعنت ہے، اور اس لعنت کا خاتمہ موجودہ حکومت کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔

محترم صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ۱۹۷۷ء میں جب اسلامی نظریاتی کونسل کی نئی تشکیل کی تو اس کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے کونسل کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ سود کے خاتمے کے لئے ٹھوس طریق کار وضع کرنے کو اولین اہمیت دے۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے آج سے دو سال پہلے اس موضوع پر اپنی مفصل رپورٹ پیش کر دی، اور حکومت نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ عنقریب بلاسود بنکاری کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔

اس اعلان کے بعد ملک کے تمام بنکوں میں "غیر سودی کھاتوں" کے نام سے ایک نئی اسکیم جاری کی گئی۔ اگرچہ بیک وقت سودی اور غیر سودی دونوں قسم کے کھاتوں کا باقی رہنا ہماری نظر میں درست نہ تھا، لیکن کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں کچھ ہونے کو غنیمت سمجھ کر ہم نے اس اسکیم کا بڑی امیدوں کے ساتھ مطالعہ کیا، لیکن یہ دیکھ کر حیرت اور افسوس کی حد نہ رہی کہ اس اسکیم کا بیشتر حصہ جوں کا توں سودی طریق کار پر مشتمل تھا، اور نام کی تبدیلی کے

سو اس میں اور سودی نظام میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔

"البلاغ" کے ان صفحات میں ہم ایک سے زائد بار اس طریق کار پر تنقید کر چکے ہیں، اور دلائل کے ساتھ، ثابت کر چکے ہیں کہ یہ طریق کار اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

گزشتہ بجٹ کے موقع پر محترم وزیرخزانہ نے ان غیر سودی کھاتوں کے لئے ایک نئی "مشارکہ اسکیم" کا اعلان کیا، اور تاثر یہ ملا کہ اب ان غیر سودی کھاتوں کی رقوم خالصۃً "شرکت" کے اسلامی اصولوں کے مطابق سرمایہ کاری میں لگائی جائیں گی۔ اس مجمل اعلان سے ایک بار پھر یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید اب ان غیر سودی کھاتوں کا قبلہ درست ہو جائے، اور کم از کم ان کھاتوں کی حد تک سود کی لعنت سے نجات مل جائے۔

ایک مدت تک ہمیں اس نئی "مشارکہ اسکیم" کی تفصیلات مہیا نہ ہو سکیں لیکن اب کچھ عرصے قبل اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو ایک بار پھر ان خوشگوار امیدوں پر پانی پھر گیا، اور یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ "مشارکہ" کے معصوم نام سے یہ اسکیم بھی سود ہی کی ایک دوسری صورت ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے سود کی مروجہ شکل سے بھی بدتر!

اس اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کسی کاروباری ادارے کو بینک سے سرمایہ لینے کی ضرورت ہو، وہ ایک متعین مدت کے لئے اپنا ایک تجارتی پروگرام وضع کر کے بینک کو اس پروگرام میں شرکت کی دعوت دے گا، بینک اگر اس پروگرام کی متوقع کامیابی سے مطمئن ہو تو اس ادارے کو "نفع و نقصان میں شرکت کی بنیاد" پر سرمایہ مہیا کرے گا۔ معاہدے کے وقت تخمینی منافع اور اس میں فریقین کا تناسب طے ہو جائے گا، پھر معاہدے کے اختتام پر حقیقی منافع کا حساب کیا جائے گا، اور اس کے مطابق حصۂ رسدی نفع تقسیم ہو گا۔

لیکن اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے نقصان کی زد کاروباری ادارے کے مد محفوظ (RESERVE) پر پڑے گی، اس کے بعد بھی اگر نقصان باقی رہے تو بینک کے حصے کے نقصان کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ جتنی رقم کا نقصان ہوا ہے، بینک اس کاروباری ادارے کے اتنی رقم کے حصص کا خود بخود مالک بن جائے گا۔

اس طریق کار میں نفع کی تقسیم کار تو بظاہر درست ہے، لیکن نقصان کی صورت میں جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ واضح طور پر شریعت کے خلاف، اور سود کی بدترین شکل ہے۔

اول تو یہ اصول بالکل غلط ہے کہ نقصان کی پہلی زد اس کاروباری ادارے کے مد محفوظ پر

پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس ادارے کا مد محفوظ بینک کی شرکت میں ہونے والے کاروبار کا جزء نہیں ہے، بلکہ اس ادارے کے سابقہ کاروبار کی بچت ہے۔ لہٰذا اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے الف ب کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرتے ہوئے یہ شرط عائد کرے کہ اگر مشترک کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے ب اسے اپنی ذاتی تجوری میں رکھی ہوئی رقم سے پورا کرے گا۔ اس شرط کے ظالمانہ ہونے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے؟

دوسرے بینک کی تلافی کا یہ عجیب و غریب طریق کار اس اسکیم میں طے کیا گیا ہے کہ وہ نقصان کی رقم کے بقدر اس ادارے کے حصص کا مالک بن جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعتہً "مشارکہ" ہے تو ایک فریق کے نقصان کی ذمہ داری دوسرے فریق پر عائد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ "سود" اور "شرکت" کے درمیان بنیادی فرق اس کے سوا اور کیا ہے کہ سود میں ایک فریق کے متعین نفع کی ضمانت ہوتی ہے، اور دوسرے فریق کا نفع موہوم ہوتا ہے، جب کہ "شرکت" میں دونوں فریق نفع و نقصان کا خطرہ بیک وقت برداشت کرتے ہیں۔

بلکہ زیر نظر اسکیم کا یہ حصہ سود کے مروجہ طریق کار سے زیادہ ظالمانہ اور استحصال پر مشتمل ہے، اس لئے کہ مروجہ طریق کار میں تو بینک سود کا روپیہ لے کر فارغ ہو جاتا، لیکن زیر نظر اسکیم میں وہ زبردستی اس کاروباری ادارے کا مستقل حصہ دار بن کر اس کے آئندہ ہونے والے تمام منافع میں ہمیشہ کے لئے دعوے دار بن جائے گا، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ یہ نئی اسکیم بھی سود اور استحصال کی بدترین شکل ہے جسے اسلام کے نام پر رائج کرنا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ شرمناک فریب کے مترادف ہو گا۔

ہم انتہائی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ خدا کے لئے اس قسم کے نیم ولانہ اقدامات سے پرہیز کیجئے، پہلے صرف ایک سودی کاروبار کا گناہ تھا، اس قسم کے اقدامات سے اس گناہ کے علاوہ (معاذ اللہ) اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ فریب کا وبال بھی شامل نہ ہو جائے۔ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ سود کے خاتمے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کا وضع کردہ طریق کار آپ کے سامنے موجود ہے، اگر اس طریق کار میں کوئی عملی دشواری نظر آتی ہے تو اسے باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے دور کر کے اسے نافذ کیجئے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، خدا کے لئے کم از کم اس بدترین سودی طریق کار سے "غیر سودی طریق کار" کا لیبل اتار دیجئے، ورنہ اسلام کے کے نام سے خالص غیر اسلامی کاروبار جاری کرنے کا

نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں برا ہے۔

ہم بحیثیت مجموعی دینی اعتبار سے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے عہد حکومت کو پچھلی حکومتوں کے مقابلے میں بسا غنیمت سمجھتے ہیں، اور اسی لئے پورے اخلاص، خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی کامیابی کے لئے دعاگو بھی ہیں اور حتی المقدور تعاون سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیکن ان کے عہد حکومت میں اس قسم کے اقدامات انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے حکومت کے خلاف شکوک و شبہات کو بھی تقویت ملتی ہے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ حکومت کو اس قسم کے افسوس ناک اقدامات سے پاک کر دے، اسے نفاذ شریعت کی صحیح فہم، اس کے لئے صحیح طریق کار اختیار کرنے کی توفیق اور اس راستے کی رکاوٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۰۳ھ

ذکر و فکر

غیر سودی بینکاری

ـــــ چند تاثرات

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا
اور
درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

سعودی عرب کے مرحوم شاہ فیصل کے صاحب زادے شہزادہ محمد الفیصل کو اللہ تعالیٰ نے اس دور میں بلاسود بینکاری کے قیام کا خاص جذبہ مرحمت فرمایا ہے، وہ سالہا سال سے دنیا کے مختلف حصوں میں غیر سودی بینک قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اور اپنی ذاتی دلچسپی اور جدوجہد سے بہت سے بینک قائم کر چکے ہیں۔ اس وقت دبی، کویت، بحرین، اردن، مصر، سوڈان، جنیوا اور دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے اسلامی بینک قائم ہو چکے ہیں جن کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ وہ سود سے پاک بینکاری کا عملی نمونہ پیش کریں گے۔

شہزادہ محمد الفیصل کی قیادت میں ان تمام بینکوں کا ایک اتحاد "الجمعیۃ العالمیۃ للبنوک الاسلامیۃ" (انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف اسلامک بینکس) کے نام سے قائم ہے، جو ان تمام اداروں کے درمیان رابطے اور تعاون کا اہتمام کرتا ہے، اور سب کی عملی مشکلات کو اجتماعی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی ایسوسی ایشن کے تحت علماء کا ایک بورڈ بھی قائم ہے جو "الرقابۃ الشرعیۃ للبنوک الاسلامیۃ" کے نام سے معروف ہے، اس بورڈ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسوسی ایشن کے تحت چلنے والے بینکوں کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیتا ہے، اور مختلف بینکوں کو

ان کے طریق کار سے متعلق فقہی مشورے دیتا ہے۔ یہ بینک عام نظام بینکاری سے ہٹ کر کام کر رہے ہیں، اس لئے ان کو اپنے کام میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، جن کے حل کے لئے وہ نئی نئی اسکیمیں شروع کرتے ہیں، ان اسکیموں کے شرعی جواز یا عدم جواز کا فیصلہ یہی بورڈ کرتا ہے۔ یہ بورڈ شیخ خاطر، شیخ بدر المتولی اور شیخ یوسف القرضاوی جیسے عالمی شہرت کے پندرہ علماء پر مشتمل ہے، اور وقتاً فوقتاً اجلاس منعقد کر کے بینکوں کے ان مسائل پر غور کرتا، اور شریعت کی روشنی میں اپنا فتویٰ دیتا ہے، اور بینک اس فتوے کی رہنمائی میں اپنا کام کرتے ہیں۔

۲۴ مارچ کو اسلام آباد میں اسی ایسوسی ایشن نے "غیر سودی بینکاری" کے موضوع پر ایک محفل مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا اور اسی موقع پر الرقابۃ الشرعیۃ" کا ایک اجلاس بھی اسلام آباد میں طے کیا گیا تھا۔ راقم الحروف کو ان دونوں اجتماعات میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اسی لئے دونوں میں شرکت کے ذریعے احقر کو اس ادارے کی کارکردگی دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی شرکت کے چند تاثرات ذیل میں پیش خدمت ہیں:۔

جہاں تک ایسوسی ایشن کے عام مذاکرے کا تعلق ہے، اس میں شہزادہ محمد الفیصل کے علاوہ مختلف ملکوں میں غیر سودی بینکوں کے سربراہ شریک تھے، جنہوں نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں غیر سودی معیشت کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ مذاکرے میں پاکستان کے متعدد بڑے بڑے مالیاتی اداروں کے سربراہ بھی مدعو تھے، جن میں سے بعض نے مقالے بھی پیش کئے، اور بعض مبصر کی حیثیت سے مذاکرے کی کارروائی میں شریک رہے۔ اس مذاکرے کا عام رجحان دو حیثیتوں سے مفید اور خوش آئند معلوم ہوا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اب سے چند سال پہلے تک عالمی مذاکروں میں جا بجا مسئلہ یہ زیر بحث آیا کرتا تھا کہ بینکوں کا انٹرسٹ "ربوا" کی تعریف میں داخل بھی ہے یا نہیں؟ اور مغرب زدہ حلقوں کا ایک بڑا عنصر ہمیشہ اس بات پر مصر رہتا تھا کہ بینکوں کا سود "ربوا" میں داخل نہیں، اس لئے وہ حلال ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب وہ دور ختم ہو گیا ہے، اب یہ بات صرف علماء کی حد تک نہیں، بلکہ مسلم ممالک کے ماہرین معاشیات و مالیات میں بھی ایک مسلم عالمی حقیقت کے طور پر مان لی گئی ہے کہ بینک انٹرسٹ "ربوا" کی تعریف میں داخل ہے، اور قطعی طور پر حرام ہے۔ چنانچہ اب مسلم ممالک میں جو بین الاقوامی کانفرنسیں یا

مذاکرے منعقد ہوتے ہیں، ان کا موضوع پہلے کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ "بینک انٹرسٹ" ربوا ہے یا نہیں؟ بلکہ اب موضوع یہ ہوتا ہے کہ بینکوں کو سود سے پاک کر کے چلانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں؟

چنانچہ اس مذاکرے کا موضوع بھی یہی تھا، مذاکرے سے خطاب کرنے والے روایتی علماء نہیں تھے، بلکہ تمام تر وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے ملکوں میں چوٹی کے ماہرین معاشیات، مالیات و بنکاری کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں۔ ان سب نے سود پر مبنی بنکاری کی معاشی مضرتوں اور غیر سودی بنکاری کے معاشی فوائد پر پوری خود اعتمادی کے ساتھ روشنی ڈالی، اور اس بات پر اپنے محکم عزم کا اظہار کیا کہ انشاء اللہ اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے بینکاری کا ایسا نمونہ پیش کریں گے جو ٹھیٹھ معاشی نقطہ نظر سے بھی زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں متعدد غیر سودی بینکوں کے قیام نے یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ سود کے بغیر بینک کا تصور محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں رہا، بلکہ اب عملی پیکر اختیار کر چکا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بینک دنیا کے صدیوں سے چلے ہوئے نظام کے مقابلے میں ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں جس کو بینکوں کی عام برادری سے تعاون نہیں مل سکتا، اس لئے ان کو متعدد عملی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ابھی شرعی اور فقہی نقطہ نظر سے بھی ان کے طریق کار میں کچھ خامیاں ہوں، لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ان بینکوں کے تمام سربراہ دو باتوں پر پوری طرح متفق ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عملی پیچیدگیوں سے ڈر کر ہار بیٹھنے کے بجائے ان پیچیدگیوں کو اپنی محنت، عزم اور جدوجہد کے ذریعہ دور کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم میں جس طرح اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ عملاً کامیاب ہو، اسی طرح ان کی کوشش یہ ہے کہ حتی الامکان وہ شرعی قواعد کے پوری طرح مطابق ہو، اور جہاں جہاں فقہی نقطہ نظر سے خامیاں ہیں، وہاں وہ کھلے دل سے ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ ایک خوش آئند ابتداء ہے، اور اگر یہ کام اسی لگن اور جذبے کے ساتھ جاری رہا تو انشاء اللہ اس کے حوصلہ افزاء نتائج بر آمد ہوں گے۔ اس وقت سودی بینکاری کے سمندر میں ان چند بینکوں کی حیثیت بظاہر چند بینکوں سے زیادہ نہیں، لیکن اس اقدام کا اثر فضا پر یہ پڑا ہے کہ ان مسلم ملکوں میں بھی غیر سودی بینکاری کا آوازہ بلند ہو رہا ہے جن کا نظام حکومت سراسر لادینی ہے۔ چنانچہ ترکی جیسے ملک میں بھی سرکاری سطح پر غیر سودی بینکوں کے قیام کی اجازت

دے دی گئی ہے، اور سوڈان میں تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سود بذریعہ عدالت قابل نفاذ نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ مسلم ممالک کو مزید ہمت اور توفیق عطا فرمائے تو یہاں غیر سودی بینکوں کی ایسی مستحکم برادری وجود میں آسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ سودی بینکوں سے آنکھیں چار کر سکے، بلکہ ان کے لئے ایک قابل تقلید مثال بن جائے۔

اس محفل مذاکرہ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے فرمائی، اور اپنے صدارتی خطاب میں جو ایمان افروز باتیں کہیں، وہ بلاشبہ پاکستان کے ہر مسلمان کے دل کی آواز ہیں، انہوں نے فرمایا کہ عالم اسلام میں نفاذ شریعت کے لئے بنیادی طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ دلوں میں ایمان و یقین کی قوت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور اس کی قدرت و رحمت کاملہ پر ٹھیک ایمان ہو تو نفاذ شریعت کے راستے کی ہر مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

انہوں نے مثال پیش کی کہ جب ہم نے پاکستان میں شراب پر پابندی عائد کی تو ایک عرصے تک پی آئی اے کی غیر ملکی پروازوں میں شراب کی فروخت کا سلسلہ جاری رہا، جب ہم نے ان پروازوں میں بھی شراب کی فروخت بند کرنے کا ارادہ کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ اس سے پی آئی اے کو لاکھوں روپے کا نقصان ہو گا، اور غیر ملکی پروازیں خسارے میں چلیں گی، لیکن ہم نے ایک دینی فریضہ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر پی آئی اے میں شراب کی فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل فرمایا کہ اب بحمد اللہ ان پروازوں میں نقصان کی بجائے نفع ہو رہا ہے۔

جناب صدر نے فرمایا کہ سود کے خاتمے کے لئے ہماری سب سے پہلی ضرورت اس بات پر مستحکم ایمان ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے حرام قرار دیا ہے، وہ ہمارے لئے ناگزیر نہیں ہو سکتی، جب ہم اس ایمان کے ساتھ کام کریں گے تو انشاء اللہ اس راستے کی رکاوٹیں دور ہوں گی، اور ہم منزل مراد تک پہنچ کر رہیں گے۔

جناب صدر کے یہ خیالات بڑے پاکیزہ، بڑے ایمان افروز اور انتہائی سلامت فکر پر مبنی ہیں، اور انہی خیالات کے ساتھ ان کا یہ اعلان بھی قابل ذکر ہے کہ حکومت اس بات کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ ملک سے جلد از جلد سود کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے۔

جناب صدر کے ان خیالات اور اعلانات کی پوری قدردانی کے باوجود ہمیں ان سے یہ

دردمندانہ گزارش کرنی ہے کہ سود کے خاتمے کے سلسلے میں سرکاری سطح پر جو کچھ اس وقت عملاً ہو رہا ہے، اس میں ان خیالات اور اعلانات کی کوئی جھلک کم از کم ہم جیسے عام آدمی کو نظر نہیں آتی، اور اس بنا پر معاندین کی بات تو الگ ہے، لیکن موجودہ حکومت کے ہمدرد اور بہی خواہ افراد بھی یہ باور کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں کہ کام کی اس رفتار کے ساتھ "جلد از جلد" خاتمہ سود کا خواب واقعتہً شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آج سے تین سال پہلے تک جن مالیاتی اداروں کو سود سے پاک کر دیا گیا تھا، گزشتہ تین سال کے دوران ان کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اس کے برعکس ہر سال نئی نئی سودی اسکیمیں منظر عام پر آرہی ہیں، بینکوں میں جو نام نہاد "غیر سودی کاؤنٹرز" کھولے گئے ہیں، ان کے طریق کار کے بارے میں ہم بارہا ان صفحات میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ درحقیقت سود ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے، اور شرعی اعتبار سے ان میں اور عام سودی کاؤنٹرز میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اب تک ان کاؤنٹروں کو صحیح معنی میں سود سے پاک کر کے شرعی قواعد کے تحت لانے کی بھی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ ہم بار بار یہ تجویز پیش کر چکے ہیں کہ کم از کم ان نام نہاد "غیر سودی کاؤنٹروں" کا طریق کار صحیح کرنے کے لئے وزارت خزانہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کا ایک مشترک اجلاس منعقد کر کے متعلقہ عملی مسائل کا جائزہ لے لیا جائے، باہمی گفت و شنید کے نتیجے میں انشاء اللہ ایسا طریق کار طے ہو سکے گا جو شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہو، لیکن ابھی تک اس قسم کی کوئی مشترک نشست بھی نہیں رکھی جا سکی۔ خلاصہ یہ کہ بحالات موجودہ معیشت کو سود سے پاک کرنے کے سلسلے میں سرکاری سطح پر ایک جمود واضح طور پر نظر آتا ہے، اور کم از کم ہمیں کوئی ایسی حرکت نظر نہیں آتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ملک تدریجاً ہی سہی، غیر سودی نظام معیشت کی طرف گامزن ہے۔

جناب صدر نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ سود کے خاتمے کے لئے ہماری بنیادی ضرورت ایمان ویقین کے استحکام کی ہے، مغرب کے مادی نظام زندگی کے تحت پرورش پائے ہوئے دماغ ہمیشہ ڈراؤنے اعداد و شمار پیش کر کے خوف دلاتے رہیں گے، لیکن اگر اس بات پر ہمارا ایمان مستحکم ہے کہ اللہ کا ہر حکم ہر قیمت پر واجب التعمیل ہے اور وہ اپنے احکام پر عمل کرنے والوں کو بلاوجہ پریشان نہیں کرے گا، تو عملی تجربہ یقیناً ان ڈراؤنے خوابوں کی تردید کر دے گا۔ جناب صدر نے پی آئی اے کی مثال بالکل صحیح دی ہے، اگر حکومت اس وقت ان "اعداد و

شار" سے مرعوب ہو کر اپنے فیصلے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی تو آج ہم اپنی پروازوں کے دوران شراب نوشی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل نہ کر پاتے، لیکن جب اللہ پر بھروسہ کر کے اس لعنت کو ختم کرنے کا عزم کر لیا گیا تو دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کس طرح آتی ہے۔

سود کے معاملے میں بھی جب تک اسی ایمان و یقین اور اسی جذبہ اطاعت خداوندی سے کام نہیں لیا جائے گا، سرمایہ دارانہ نظام کا یہ عفریت ہماری معیشت کو اپنے خونخوار پنجوں سے آزاد نہیں کرے گا۔ پچھلے دنوں سوڈان کی کابینہ کے ایک اہم رکن ڈاکٹر حسن الترابی پاکستان آئے تھے، انہوں نے خود مجھے بتایا کہ سوڈان میں یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ بینک اگر سودی کاروبار کرتے ہیں تو وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا کریں، آئندہ عدالت کے ذریعہ سود کی کوئی ڈگری نہیں دی جائے گی۔ اس اعلان کو ایک مدت گزر چکی ہے، لیکن وہاں اس اعلان کی وجہ سے ملکی معیشت پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑا۔ اگر سوڈان یہ ہمت کر سکتا ہے تو پاکستان ـــــ جس کی بنیاد ہی اسلام کے نام پر اٹھی ہے۔ یہ حوصلہ کیوں نہیں کر سکتا؟

ان تمام گزارشات کا مقصد اعتراض برائے اعتراض نہیں، بلکہ پوری دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ حکومت کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ اقتدار و اختیار اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی امانت ہے، یہ امانت ہمیشہ کسی ایک کے ہاتھ میں نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نفاذ شریعت کا ایک زریں موقع عطا فرمایا ہے، اور اس کے لئے ایک طویل مہلت دی ہے، اگر آپ اسی مہلت کو صحیح استعمال کر کے کم از کم سود جیسے بڑے بڑے منکرات سے قوم کو نجات دلانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ دنیا و آخرت میں آپ کے لئے سرخروئی کا باعث ہو گا، اور یہ قوم جس کی بھاری اکثریت دل سے اسلامی احکام کے تحت زندگی گزارنا چاہتی ہے، آپ کو دعائیں دے گی، لیکن اگر خدانخواستہ آپ اس مہلت کو صحیح استعمال نہ کر سکے تو دنیا و آخرت میں اس کی جواب دہی بھی بڑی سنگین ہے۔ لہٰذا خدا کے لئے مزید وقت ضائع کئے بغیر سود کی لعنت سے قوم کو نجات دلانے کے لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ عملی قدم اٹھایئے انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی۔ قرآن کریم نے سود کو "اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ جنگ کے مترادف قرار دیا ہے، اور جب تک ہم اس "جنگ" سے صدق دل کے ساتھ توبہ نہیں کریں گے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سزاوار کیسے ہوسکتے ہیں؟ اور اگر ہم ایک مرتبہ سچے دل سے یہ تہیہ کر لیں کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ اس باغیانہ جنگ کو ہر قیمت پر ختم کر

کے دم لیں گے تو پھر باری تعالیٰ کی طرف سے بشارت یہ ہے کہ:

ولو انہم آمنوا واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء

اور اگر وہ ایمان لائیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان ویقین کی اس دولت سے مالا مال فرمائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو اس کے ذریعے کچل سکیں، اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے اس کے اسباب غضب کو دور اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کو متوجہ کر سکیں۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۲۶ جمادی الثانیہ ۱۴۰۴ھ

ذکر و فکر

سود کا مکمل خاتمہ

ـــــ وزیر خزانہ کا نیا اعلان

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

سال رواں کا بجٹ پیش کرتے ہوئے ملک کے وزیر خزانہ جناب غلام اسحٰق خان صاحب نے غیر سودی نظام بینکاری کے قیام کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے، ہم اس مرتبہ ان صفحات میں اس کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

محترم وزیر خزانہ نے فرمایا ہے کہ صدر مملکت جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ملک سے سود کے خاتمے کے لئے اکتوبر ۱۹۸۵ء کی جو آخری حد مقرر کی تھی، ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ انشاء اللہ اس سے چند ماہ قبل، یعنی جولائی ۱۹۸۵ء ہی میں ملک سے سودی نظام کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے گا، اور اس تاریخ کے بعد ملک کا کوئی بینک سود کی بنیاد پر لین دین نہیں کرے گا۔

مدت کے تعین کے بارے میں اختلاف رائے ممکن ہے، لیکن محترم وزیر خزانہ کی سنائی ہوئی اس خوشخبری کا ہر وہ شخص خیر مقدم کرے گا جسے پاکستان سے محبت ہے، اور جو یہاں اسلام کے احکام و تعلیمات کو عملاً جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ خبر ہے جسے سننے کے لئے عرصے سے کان ترس رہے تھے، اور مقام شکر ہے کہ بعد از خرابی بسیار سہی، یہ خوشخبری سننے میں آ ہی گئی۔

لیکن ماضی میں غیر سودی نظام معیشت کے قیام کے سلسلے میں جو تلخ تجربات سامنے آتے رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ مسرت شکوک و شبہات کی آمیزش سے خالی نہیں ہے۔ اور جو لوگ ملک میں خالص اسلامی نظام معیشت کا چلن دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے دل میں اس تاریخ کے انتظار و اشتیاق کے ساتھ متعدد سوالات بھی پیدا ہو رہے ہیں جو ایک بار پھر ہم پوری دردمندی کے ساتھ حکومت کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے متعدد اعلانات کے ذریعے سودی نظام کے خاتمے کو اپنی ترجیحات میں نمایاں طور پر شمار کیا تھا، چنانچہ جب ۱۹۷۷ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی نئی تشکیل ہوئی، اور صدر مملکت نے اس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا تو کونسل کے سامنے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ وہ ملک سے سود کی لعنت ختم کرنے کے لئے مفصل طریق کار وضع کرے۔ اس وقت راقم الحروف بھی کونسل کا رکن تھا، اور خاتمہ سود سے جناب صدر کی یہ گہری دلچسپی نہ صرف ہم سب کے لئے باعث صد مسرت ہوئی، بلکہ پورے ملک میں اس پر اطمینان کا اظہار کیا گیا، کیونکہ وہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے کسی سربراہ نے اس مسئلے کو اتنی اہمیت کے ساتھ چھیڑا ہو، ورنہ اس سے قبل ملک کے اصحاب اقتدار نے کبھی اس مسئلے پر سوچنے کے لئے چند منٹ خرچ کرنے کی بھی زحمت گوارا انہیں کی تھی، بلکہ بعض افراد تو الٹا سود کو نہ صرف حلال طیب، بلکہ معیشت کے لئے ناگزیر قرار دینے پر مصر تھے۔

جناب صدر کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کونسل نے بڑے ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ غیر سودی معیشت کا عملی خاکہ تیار کرنے کے لئے کام شروع کیا، اس غرض کے لئے ماہرین معاشیات اور بینکروں کا ایک پینل بنایا، اور بالآخر غیر سودی بینکاری پر ایک جامع اور مفصل رپورٹ تیار کر کے حکومت کو پیش کر دی۔

اس کے بعد حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ ملک کے تمام بینکوں میں غیر سودی کاؤنٹرز نفع نقصان کی بنیاد پر کھولے جائیں گے۔ اگرچہ ہمیں اس طریق کار سے اختلاف تھا کہ سودی اور غیر سودی دونوں قسم کے کھاتے متوازی طریقے پر جاری رہیں اور لوگوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ چاہیں تو حلال طریقہ اختیار کریں اور چاہیں تو حرام طریقہ اپنائیں۔ اور اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار کونسل کے ذریعے حکومت پر کر بھی دیا گیا تھا، لیکن کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں "کچھ ہونے" کو پھر بھی ہم نے غنیمت سمجھا، اور یہ خیال ہوا کہ حکومت اس کو غیر سودی نظام کی طرف پہلے قدم کے طور پر اختیار کرے تو فی الحال اسے گوارا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

لیکن جب ان غیر سودی کاؤنٹروں کا طریق کار تفصیلاً سامنے آیا تو یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ اس اکاؤنٹ کے طریق کار میں عملاً سود کی روح اسی طرح جاری و ساری ہے، جس طرح عام سودی اکاؤنٹس میں، ہم "البلاغ" کے ان صفحات میں اس کے مفصل دلائل پیش کر چکے ہیں۔ اب جبکہ ملک سے سود کے مکمل خاتمے کا اعلان کیا گیا ہے، دل میں یہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ یہ خاتمہ اسی طرح کا تو نہیں ہو گا جیسا پی ایل ایس اکاؤنٹ میں ہوا، یعنی سود کے صرف نام کا خاتمہ۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ملکی معیشت کا اس سے بڑا المیہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

غیر سودی نظام بینکاری کی کامیابی اس بات پر موقوف ہے کہ مسلمان اس میں اس اطمینان کے ساتھ حصہ لیں کہ یہ نظام کسب حرام کی آمیزش سے پاک اور شرعی اعتبار سے بے نقص اور حلال و طیب ہے۔ اور یہ اطمینان محض ظاہری حیلوں کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اب جبکہ حکومت نے بینکاری کو سود سے بالکلیہ پاک کرنے کا مبارک عزم ظاہر کیا ہے، یہ عزم بھی کر لینا چاہیئے کہ اس نئے نظام میں وہ سنگین غلطیاں نہیں دہرائی جائیں گی جنہوں نے پی ایل ایس اکاؤنٹ کو شرعی اعتبار سے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

محترم وزیر خزانہ کا یہ اعلان کہ جولائی ۱۹۸۵ء تک ملک سے سودی بینکاری کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا، لائق مبارکباد ہے، لیکن ان سے ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر سود کا صرف نام ختم کرنا نہیں، بلکہ ملکی معیشت سے اس شجرہ خبیثہ کی جڑ نکالنی مقصود ہے تو خدا کے لئے پی ایل ایس اکاؤنٹ کے موجودہ طریق کار سے ملک کو نجات دلایئے اور اگر اسی طریق کار کو مزید توسیع دے کر تمام اکاؤنٹس میں جاری کرنا پیش نظر ہے، اور اسی کو سود کے مکمل خاتمے کا نام دیا جا رہا ہے تو یہ ملک و ملت کے ساتھ ایک شرمناک فریب کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

ہم ان صفحات میں بھی، اور دوسرے ذرائع سے بھی، نہ جانے کتنی مرتبہ یہ تجویز پیش کر چکے ہیں کہ وزارت خزانہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک مشترک اجلاس میں پی ایل ایس اکاؤنٹ کے موجودہ طریق کار کا جائزہ لیا جائے، اس کی شرعی خامیاں دور کی جائیں، اور اگر کوئی عملی دشواری سامنے آئے تو اسے سر جوڑ کر شرعی اصولوں کے مطابق طے کیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج تک اس تجویز پر عمل نہیں ہوا۔

یہ خبریں آئے دن اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ غیر سودی بینکاری کو فروغ دینے کے لئے

وزارت خزانہ اور ماہرین کافلاں اجلاس ہوا، اور اس میں بہت سے امور طے کئے گئے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کام کے لئے وزارت خزانہ کے مشیر کون لوگ ہیں؟ جو کسی اسکیم کے سودی یا غیر سودی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، قاعدے کی بات تو یہ تھی کہ اس غرض سے ملک میں ایک دستوری ادارہ "اسلامی نظریاتی کونسل" کے نام سے موجود ہے، اس معاملے میں پہلی مفصل رپورٹ بھی اسی نے پیش کی ہے، لہٰذا اس جہت کی ہر عملی کاروائی میں اسے اعتماد میں لیا جائے، اور اس کی شرکت اور تعاون سے یہ کام آگے بڑھے۔ لیکن ہماری معلومات کی حد تک کونسل اس پورے عمل سے الگ تھلگ رہی ہے، اور نت نئی اسکیمیں شروع کرتے وقت اس سے مشورے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اس وقت اگرچہ کونسل اپنی مدت ختم ہونے کی بنا پر موجود نہیں ہے، لیکن اول تو اس کی تشکیل جدید جلد ہونی چاہئے، دوسرے کونسل کے ارکان بہرحال موجود ہیں، اور ان کے علاوہ بھی جن اہل علم اور ماہرین کی رائے اس بارے میں مفید ہو سکتی ہے، وہ جانے پہچانے ہیں۔ ان کے تعاون سے ایسی اسکیمیں تیار کی جا سکتی ہیں جو شرعی خامیوں سے پاک ہوں۔

لہٰذا ہم ایک بار پھر پوری دلسوزی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ نئے غیر سودی نظام کو نافذ کرتے وقت اس بات کی ضمانت دے کہ وہ سو فی صد اسلامی اصولوں کے مطابق ہو گا، اور اس میں سود کا کوئی شائبہ باقی نہیں رکھا جائے گا۔ ابھی وقت ہے کہ اس اعتبار سے نئے نظام کے قابل اعتماد ہونے کا اطمینان خود بھی کر لیا جائے، اور عوام کے دل میں بھی اس کا اعتماد پیدا کیا جائے، ورنہ یہ صورت کوئی اچھی نہیں ہو گی کہ حکومت سود کے مکمل خاتمے کا اعلان کرے، اور ملک کے علماء اور اہل بصیرت حضرات اس کا خیرمقدم کرنے کے بجائے اس کی شرعی خامیوں کی بنا پر اس کے خلاف احتجاج کریں۔

حکومت کو ایک بار پھر بروقت متوجہ کر کے ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں، اب یہ حکومت کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ موجودہ نظام میں تبدیلی کے لئے کیا طریق کار اختیار کرتی ہے؟ وہ طریق کار جس کے ذریعے نہ صرف سود کا عفریت جوں کا توں ملت پر مسلط رہے، بلکہ اس کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اور غم و غصہ میں حکومت بھی حصہ دار بن کر رہے، یا وہ طریق کار جس سے واقعۃً ملک کو اس لعنت سے چھٹکارا نصیب ہو، اور اس ملک کے مسلمان اس حکومت کو عمر بھر دعائیں دیں جس کی بدولت انہیں یہ چھٹکارا نصیب ہو۔

اقتدار کبھی کسی کا ہمیشہ ساتھ نہیں دیتا، لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے اقتدار و اختیار کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، سود پر قرآن کریم نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اعلان جنگ کی شدید ترین وعید سنائی ہے، اور جو حکمران اس خطرناک جنگ سے واقعتہً ملک کو نجات دلائیں گے، ان پر انشاء اللہ خدا کی طرف سے رحمتیں نازل ہوں گی۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب اقتدار کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق بخشے، اور ان کو محض نام لینے کے لئے نہیں، بلکہ حقیقتہً سود کی لعنت ختم کرنے کا سچا جذبہ اور اس کے لئے اخلاص عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۲۸ شوال ۱۴۰۴ھ

و ما علینا الا البلاغ

ذکر و فکر

بلا سود بینکاری

ـــــــ حکومت کے تازہ خوش آئند اقدامات

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ کے شمارے میں ہم نے وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان صاحب کے اس اعلان پر تبصرہ کیا تھا جو انہوں نے سال رواں کا بجٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا، کہ جولائی ۱۹۸۵ء تک تمام بنکوں سے سودی لین دین بالکلیہ ختم کر دیا جائے گا۔ اپنے تبصرے میں ہم نے اس اعلان کے خیرمقدم کے ساتھ ساتھ ان شکوک و شبہات کا بھی ذکر کیا تھا جو عام طور پر ذہنوں میں پائے جاتے ہیں، یعنی یہ کہ سود کا یہ خاتمہ اگر اسی طرح عمل میں آیا جس طرح موجودہ پی ایل ایس اکاؤنٹ میں کیا گیا ہے تو یہ محض نام کی تبدیلی ہو گی، ورنہ حقیقۃً سود کی عملداری پہلے کی طرح جاری رہے گی۔

ہمارا یہ تبصرہ وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر کے اس حصے پر مبنی تھا جو ۱۵ جون ۱۹۸۴ء کے اخبار "جنگ" میں شائع ہوا تھا۔

لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ "جنگ" کے اس شمارے میں ان کی تقریر پوری شائع نہیں ہوئی، اور انہوں نے اپنی تقریر میں سود کے خاتمے سے متعلق اپنی حکمت عملی اور منصوبوں کا کافی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے قبل ہم نے وزیر موصوف کی مذکورہ تقریر کا مکمل متن حاصل کیا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی، اور اس مکمل تقریر کو پڑھنے کے بعد جو نئی

معلومات حاصل ہوئیں ان کے بعد اپنا سابقہ تبصرہ نہ صرف ناکافی، بلکہ قابل اصلاح و ترمیم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا آج کی نشست میں اس موضوع پر دوبارہ اپنی معروضات پیش کرنا مقصود ہے۔

محترم وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر میں سب سے پہلی بات جو ہمارے لئے باعث صد مسرت اور حکومت کے لئے قابل مبارکباد ہے، وہ یہ کہ موجودہ مالی سال سے پی ایل ایس اکاؤنٹ کی چند واضح ترین خرابیاں جنہوں نے اسے سود ہی کی دوسری شکل بنا دیا تھا، بفضلہ تعالیٰ دور کر دی گئی ہیں، اور محترم وزیر خزانہ نے اپنی اس تقریر میں صریح الفاظ کے ساتھ ان خرابیوں کے بارے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ چونکہ اہل علم و فکر نے ان خرابیوں کی نشان دہی کر کے اس طریق کار کو شرعی اعتبار سے ناقابل قبول قرار دیا تھا، اس لئے اب یہ طریق کار تبدیل کیا جا رہا ہے۔

اس اجمال کی وضاحت کے لئے تھوڑی سی تفصیل درکار ہوگی:۔

جنوری ١٩٨١ء میں جب حکومت نے پہلی بار "غیر سودی کاؤنٹرز" کے نام سے ہر بنک میں ایک نیا کھاتہ جاری کیا (جسے عام طور سے پی ایل ایس اکاؤنٹ یا نفع و نقصان کے شراکتی کھاتے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) تو ہم نے اسی وقت اس کھاتے کے مفصل طریق کار کا مطالعہ کر کے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ کھاتہ سود ہی کی ایک شکل ہے، اور اسے غیر سودی کھاتہ کہنا درست نہیں۔ ہماری یہ رائے مفصل دلائل کے ساتھ "البلاغ" کے ربیع الثانی ١٤٠١ھ کے شمارے میں شائع ہوئی، ملک کے متعدد اخبارات نے بھی اسے نقل کیا، اور حکومت کے اداروں میں بھی اس کی نقول بھجوائی گئیں۔

اپنے اس مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ واضح کیا تھا کہ سودی نظام بنکاری کے خاتمے کے بعد اصل متبادل راستہ شرکت و مضاربت یا قرض حسن ہے، لیکن بینک کے بعض امور کی انجام دہی میں جہاں شرکت یا مضاربت ممکن نہ ہو، وہاں محدود پیمانے پر بعض اور طریقے بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ "بیع مؤجل" ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سودی نظام میں جو لوگ کوئی مال خریدنے کے لئے بینک سے سود پر قرض لیتے ہیں، بینک ان کو نقد قرضہ دینے کے بجائے مطلوبہ مال خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کر دے، اور قیمت کی ادائیگی کے لئے کوئی مدت مقرر کر لے۔

اس طریق کار کو "بیع مؤجل" اور بینک کو اس بیع کے ذریعے جس تناسب سے نفع حاصل ہو گا، اس کو "مارک اپ" کہا جاتا ہے۔ اگر بینک واقعۃً مطلوبہ مال خرید کر قبضے کے بعد اس طرح فروخت کرے اور اس پر نفع کمائے تو شرعاً اسکی گنجائش ہے، اب تک "پی۔ ایل۔ ایس اکاؤنٹ" میں اس طریق کار کو بری طرح مسخ کر کے استعمال کیا گیا یعنی اول تو بینکوں نے مطلوبہ مال خرید کر اسے بیچنے کے بجائے اپنے گاہکوں کو نقد رقم ہی دیدی، اور کہا کہ وہ اس رقم سے مال خود خریدیں، لیکن فرض یہ کریں کہ مال بینک نے انہیں "بیع مؤجل" کے طریقے پر فروخت کیا ہے، پھر اس کی قیمت ایک خاص تناسب سے "مارک اپ" لگا کر معینہ وقت پر بنک کو ادا کریں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بیع کا صرف نام ہی نام ہوا، ورنہ بینک نے درحقیقت رقم ہی کا لین دین کیا، مطلوبہ مال نہ کبھی بینک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں آیا، اور نہ اس نے کبھی اپنے گاہک کو مال ادا کیا۔

دوسرے اس معاملے میں یہ بھی شرط لگا دی گئی تھی کہ اگر گاہک نے معینہ وقت پر قیمت ادا نہ کی تو قیمت میں ایک خاص تناسب سے مزید اضافہ کیا جاتا رہے گا، جسے "مارک اپ کے اوپر دوسرا مارک اپ" کہا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس طریق کار کو صرف نام کی تبدیلی کے ساتھ سود کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا، چنانچہ ہم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

> "یہ طریق کار واضح طور پر سود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر "انٹرسٹ" کے بجائے نام "مارک اپ" رکھ دیا جائے، اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں تو اس سے "غیر سودی نظام" کیسے قائم ہو جائے گا؟"

(البلاغ، ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ صفحہ ۹)

اور پھر یہ مطالبہ کیا تھا کہ:۔

> "جن مقامات پر "مارک اپ" کا طریقہ باقی رکھنا ناگزیر ہو، وہاں اس کی شرعی شرائط پوری کی جائیں۔ یعنی اول تو قیمت کی ادائیگی میں تاخیر پر "مارک اپ" کی شرحوں میں اضافے کی شرط کو فی الفور ختم کیا جائے، کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ "مارک اپ" کی بنیاد پر فروخت کیا جانے والا سامان بینک کے قبضے میں لا کر فروخت کیا جائے گا۔" (ایضاً صفحہ ۱۳)

۱۴۰۱ھ سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے مختلف ذرائع اور مختلف اسالیب اور عنوانات سے ہم حکومت کو مارک اپ کے طریق کار کی ان سنگین خامیوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ محترم وزیر خزانہ نے مارک اپ کے طریق کار کی خامیوں کو دور کرنے کا اعلان کر دیا ہے، چنانچہ وہ بجٹ تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"مارک اپ پر مارک اپ کا جو طریقہ پہلے پی ایل ایس نظام میں شامل تھا، اس پر شریعت کے نقطہ نظر سے اعتراضات ہوئے، چنانچہ ان اعتراضات کے نتیجے میں آئندہ یہ طریقہ بالکلیہ ختم کر دیا جائے گا اس کے بجائے نادھندگی کی صورت میں مالیاتی ادارہ ایسے سرسری سماعت کے ٹریبونل سے رجوع کر سکے گا جو اس مقصد کے لئے قائم کئے جائیں گے۔"

(بجٹ تقریر صفحہ ۲۵ و ۲۶)

چنانچہ وزیر خزانہ کے اس اعلان کی تعمیل کے طور پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے تمام بینکوں کو یہ ہدایت جاری کر دی ہے، پندرہ روزہ اسٹیٹ بینک نیوز کی یکم جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں غیر سودی تمویل کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے "مارک اپ" کے طریقے کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

"بینک مختلف اشیاء خریدیں گے، پھر وہ اشیاء اپنے گاہکوں کو بیع موجل کے طریقے پر مناسب مارک اپ کے ساتھ فروخت کریں گے۔ لیکن نادھندگی کی صورت میں اس مارک اپ پر کسی مزید مارک اپ کا اضافہ نہیں ہو گا"۔

(اسٹیٹ بینک نیوز جلد ۲۳ شمارہ ۱۳ صفحہ ۱ کالم نمبر۲)

"مارک اپ" کے طریق کار میں یہ اصلاح ہر لحاظ سے باعث مسرت اور مستقبل کے لئے نہایت خوش آئند علامت ہے۔

پی ایل ایس اکاؤنٹ میں ایک دوسری اسکیم بعد میں "مشارکہ" کے نام سے شروع کی گئی، اس اسکیم کا بھی ہم نے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا، لیکن یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ اس اسکیم میں بھی صرف نام ہی "مشارکہ" ہے، ورنہ سود کی حقیقت وہاں بھی موجود ہے، چنانچہ

,البلاغ، کے رجب ۱۴۰۳ھ کے شمارے میں ہم نے اس نئی اسکیم پر بھی مفصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ نئی اسکیم بھی سود اور استحصال کی بدترین شکل ہے جسے اسلام کے نام پر رائج کرنا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ شرمناک فریب کے مترادف ہو گا۔"

(البلاغ، رجب ۱۴۰۳ھ صفحہ ۵)

اس اسکیم کے تحت بینک کسی کاروباری ادارے کے کسی میعادی تجارتی پروگرام میں سرمایہ لگا کر اس کا شریک بنتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اگر اس کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے نقصان کی زد کاروباری ادارے کے مد محفوظ پر پڑے گی، اس کے بعد بھی اگر نقصان باقی رہے تو بینک کے حصے کے نقصان کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ جتنی رقم کا نقصان ہوا ہے، بینک اس کاروباری ادارے کے اتنے رقم کے حصص کا خود بخود مالک بن جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح نقصان کی تمامتر ذمہ داری دوسرے فریق کی طرف منتقل کرنے کی جو شرط لگائی گئی تھی، اس نے "مشارکہ" کی ساری روح ملیامیٹ کر کے رکھ دی تھی، چنانچہ ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ:۔

"خدا کے لئے اس قسم کے نیم دلانہ اقدامات سے پرہیز کیجئے پہلے صرف ایک سودی کاروبار کا گناہ تھا، اس قسم کے اقدامات سے اس گناہ کے علاوہ معاذ اللہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ فریب کا وبال بھی شامل نہ ہو جائے۔" (ص ۵)

مقام شکر و مسرت ہے کہ محترم وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں "مشارکہ" کے اس طریق کار کو بھی ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے، چنانچہ وہ "مشارکہ" و "مضاربہ" کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تمویل کے یہ طریقے خاص خاص مواقع پر پہلے بھی اختیار کئے جاتے رہے ہیں، لیکن اب ان کا استعمال وسیع تر دائرے میں پھیلا دیا جائے گا، لیکن اس وقت "مشارکہ" اور پی ٹی سی (پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کے معاہدات میں جو شق موجود ہے کہ مالیاتی ادارے

(بنک وغیرہ) کے حصے میں جو نقصان آئے گا، اسے کاروباری ادارے کے حصص کے اجراء سے پورا کیا جائے گا، چونکہ اس شق پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ شق غیر اسلامی ہے، اس لئے آئندہ مشارکہ کے معاہدے میں یہ شق باقی نہیں رہے گی"۔

(بجٹ تقریر ص ۴۶)

"مارک اپ" اور "مشارکہ" کی اسکیموں میں اہل علم و فکر کے مطالبے کے مطابق ان تبدیلیوں کے اعلان سے ہمیں دوہری مسرت حاصل ہوئی ہے۔ سب سے پہلی مسرت تو اس بات کی ہے کہ ان اسکیموں کی حد تک صریح اور واضح سود سے قوم کو نجات ملی، دوسرے اس بات کو مسرت بھی کم نہیں کہ حکومت نے بدیر سہی، لیکن بالآخر غلطی پر اصرار کے بجائے تعمیری تنقید کو قبول کرنے کی طرح ڈالی، ورنہ اب تک ان تنقیدوں کے بارے میں یہ کہہ کر بات ٹلا دی جاتی تھی کہ یہ معیشت اور مالیاتی امور کے بارے میں غیر ماہرانہ آراء ہیں جن کو ملک کے نازک مالیاتی امور میں دور رس فیصلوں کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ تیسرے ان اصلاحات سے پہلی بار اس بات کی واضح علامت ملی ہے کہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء تک سودی کاروبار ختم کرنے کا اعلان نرا مذاق نہیں، بلکہ حکومت اس سمت میں واقعۃً پیش قدمی کر رہی ہے۔

محترم وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں یکم جولائی ۱۹۸۵ء تک سود ختم کرنے کے لئے تاریخ وار پروگرام کا بھی اعلان کیا ہے، اور اس اعلان کے مطابق اسٹیٹ بینک نے تمام بینکوں کو ہدایت بھی جاری کر دی ہیں۔ یہ پروگرام وزیر خزانہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

"جیسا کہ پچھلے سال وعدہ کیا گیا تھا، نظام بینکاری سے سود کی مکمل استیصال کے لئے اسٹیٹ بینک اور قومی تجارتی بنکوں کے مشورے سے ایک ٹھوس پروگرام وضع کر لیا گیا ہے۔ یہ پروگرام ملک کے تمام بینکوں اور مالیاتی اداروں پر اطلاق پذیر ہو گا، جن میں وہ غیر ملکی بنک بھی داخل ہیں جو پاکستان میں کام کر رہے ہیں، اور اس پر آئندہ مالی سال سے عمل شروع ہو جائے گا۔ یہ پروگرام مندرجہ ذیل ہے:۔

(الف) یکم جنوری ۱۹۸۵ء سے حکومت، سرکاری شعبے کی

کارپوریشنوں، اور تمام جائنٹ اسٹاک کمپنیوں کو، خواہ وہ پبلک ہوں یا پرائیویٹ، اور تمام جائنٹ اسٹاک کمپنیوں کو، خواہ وہ پبلک ہوں یا پرائیویٹ، بینکوں کی طرف سے کی جانے والی ہر تمویل مکمل طور پر اسلامی طریقوں کے مطابق ہوگی .... (یکم جنوری سے قبل) چھ ماہ کا یہ عبوری زمانہ اس لئے ناگزیر ہے کہ اس دوران متعلقہ قوانین میں مطلوبہ تبدیلیاں لائی جائیں، حسابات رکھنے کے نئے مناسب طریقوں کو رواج دیا جائے، بینک اپنے عملے کو ضروری تربیت دے سکے، اور اسی طرح کی دوسری تیاریاں عمل میں لائی جائیں۔

(ب) یکم اپریل ۱۹۸۵ء سے افراد اور فرموں کو کی جانے والی تمویل بھی مکمل طور پر شریعت کے مطابق تبدیل کرنی لازمی ہوگی .... اور اس طرح یکم اپریل ۱۹۸۵ء تک بنکوں اور مالیاتی اداروں کے اثاثوں کی سمت (Asset Side) مکمل طور پر اسلامی طریقہ ہائے تمویل میں تبدیل ہو جائے گی۔ صرف ماضی کے معاہدات باقی رہیں گے جن کو پورا کرنا ہوگا۔

(ج) یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے کوئی بنک کوئی سودی ڈپازٹ قبول نہیں کرے گا۔ تمام بچت اور میعادی کھاتے مسلمہ اسلامی طریقہ ہائے تمویل میں تبدیل ہو جائیں گے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ، موجودہ دور کی طرح بغیر کسی منافع کے جاری رہیں گے۔

(د) اسلامی طریقہ ہائے تمویل کو زرعی شعبے اور امداد باہمی کے اداروں تک بھی وسیع کر دیا جائے گا۔

(ہ) اسٹیٹ بینک کے تمام معاملات، خواہ وہ حکومت سے ہوں یا تجارتی بینکوں سے، وہ بھی یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے پہلے پہلے نئے طریقہ ہائے تمویل سے بدل دیئے جائیں گے۔

ان خوش آئند فیصلوں پر ہم حکومت کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بات کی مکمل توفیق اور ہمت عطا فرمائیں کہ وہ ملک کے معاشی نظام کو واقعۃً سود کی لعنت سے پاک کر کے ٹھیک ٹھیک اسلامی تقاضوں کے مطابق بنانے میں کسی ذہنی

تحفظ اور کسی مرعوبیت و مغلوبیت کے روا دار نہ ہوں، اور مجوزہ نظام میں شرعی نقطہ نظر سے جو خامیاں اب بھی باقی ہیں، انہیں بھی دور کر کے صحیح معنی میں اسلامی نظام معیشت کے قیام کی راہ ہموار کر سکیں۔ آمین، ثم آمین۔

محترم وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں ان طریقوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو سودی معاملات ختم کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں گے، اور اسٹیٹ بینک نے اپنے ایک سرکلر کے ذریعے تمام بینکوں کو ان کے مطابق کام کرنے کی ہدایات بھی جاری کر دی ہیں جو اسٹیٹ بینک نیوز کے یکم جولائی ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی محترم وزیر خزانہ نے کچھ عملی مسائل کا ذکر کر کے ملک کے علماء اور اہل فکر سے کچھ سوالات بھی کئے ہیں جن کا شرعی حل انہیں مطلوب ہے۔

ہمارے نزدیک یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام طریقوں کا بنظر غائر مطالعہ کریں جو اس نئے نظام کے لئے تجویز کئے گئے ہیں، اور اگر ان میں شرعی اعتبار سے نقائص ہوں تو ان کے بارے میں اپنی آراء اور تجاویز پہلے سے حکومت کو ارسال کریں، تاکہ یکم جولائی سے پہلے پہلے ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش ہو سکے، نیز محترم وزیر خزانہ نے جو سوالات کئے ہیں، ان کا جواب بھی فراہم کریں۔

غیر سودی بینکاری کے لئے مجوزہ طریقوں کی تفصیل اور وزیر خزانہ کے سوالات پر اپنا تبصرہ ہم انشاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں پیش کریں گے، لیکن تین گزارشات اسی وقت پیش کرنی ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ "مارک اپ" کے طریق کار کے جواز کے لئے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ بینک واقعۃً کوئی شے اپنے گاہک کو فروخت کرے، محض اس کو رقم دے کر یہ سمجھنا کہ اس رقم سے جو چیز گاہک خریدے گا وہ بینک نے اسے فروخت کی ہے، ہرگز جائز نہیں ہو گا، اگرچہ اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں باقاعدہ "خرید و فروخت" کے ذکر سے ظاہر یہی ہے کہ واقعۃً معاملہ بیع ہی کا ہو گا، گاہک کو رقم نہیں دی جائے گی، لیکن چونکہ بینک پہلے اس طریق کار کے عادی رہے ہیں، اس لئے انہیں اس سلسلے میں صراحت کے ساتھ ہدایات جاری کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے "مارک اپ" کا طریق کار تو اب انشاء اللہ بڑی حد تک درست ہو جائے گا،

لیکن اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں ایک طریقہ "ٹریڈبلز کی خریداری" بھی قرار دیا گیا ہے، اور اس کی تفصیل میں کہا گیا ہے کہ ان بلوں کی خریداری "مارک ڈاؤن" کی بنیاد پر ہوگی، جس کا حاصل یہ ہے کہ بلز آف ایکس چینج اور ہنڈیوں کو بھنانے کے لئے بعینہ وہی طریق کار جاری رہے گا جو آج بینکوں میں جاری ہے، صرف اتنا فرق ہو گا کہ کٹوتی یا بٹہ لگانے (Discount) کے بجائے مارک ڈاؤن یا کمیشن کی اصطلاح استعمال ہو گی۔

یہ بات شرعی اعتبار سے قابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔ للذا ہماری گزارش یہ ہے کہ جس طرح "مارک اپ" کے طریق کار کو حکومت نے تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا ہے، اسی طرح بلز آف ایکس چینج کو بھنانے کا طریق کار بھی تبدیل کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی خاتمہ سود کی رپورٹ میں ایک طریق کار تجویز کیا گیا ہے، اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کوئی عملی دشواری محسوس ہوتی ہے تو باہمی گفت و شنید سے کوئی اور مناسب طریق کار طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ طریق کار کو جوں کا توں برقرار رکھنا کسی طرح درست نہیں ہو گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وزیر خزانہ کی تقریر اور اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں مشارکہ، پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم منافع کی شرح وقتاً فوقتاً اسٹیٹ بینک کی طرف سے مقرر کی جائے گی، البتہ نقصان کی صورت میں نقصان ہر فریق اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے برداشت کرے گا۔

اس میں اگر اسٹیٹ بینک کی طرف سے منافع کی شرح مقرر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک مجموعی منافع کے تناسب سے تجارتی بینکوں کا فی صد حصہ مقرر کرے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ غیر سودی نظام بینکاری میں زر کے بہاؤ پر کنٹرول کرنے کے لئے اسٹیٹ بینک کے پاس یہ موثر ترین ذریعہ ہو گا، لیکن اگر خدانخواستہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک سرمائے کے تناسب سے بینکوں کا کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ منافع مقرر کرے گا تو یہ انتہائی قابل اعتراض بات ہے، اور اس کا نتیجہ پھر اسی سودی طریق کار کے تحفظ کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں شرح منافع کے لئے جو لفظ (Rates of Profit) استعمال ہوا ہے، اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید پیش نظر یہ دوسری صورت ہے، اور مقصد یہ ہے کہ بینک سے مشارکہ وغیرہ کا معاملہ کرنے والے کاروباری افراد یا اداروں کو اطمینان دلایا جائے کہ اگر کاروبار کا حقیقی منافع اسٹیٹ بینک کی مقرر کردہ حد سے زائد ہوا تو وہ بینک اپنے پاس رکھنے کے

بجائے انہی کو واپس کر دے گا۔ لٰہذا ان کو یہ خوف نہ کھانا چاہئے کہ اگر منافع زیادہ ہوا تو اس کا بہت بڑا حصہ بینکوں کے پاس چلا جائے گا۔

اگر اسٹیٹ بینک کے شرح منافع متعین کرنے کا مقصد واقعتہً یہی ہے تو ایک طرف شرعی اعتبار سے اس کا ہرگز کوئی جواز نہیں، اور دوسری طرف اس سے غیر سودی نظام کا کوئی فائدہ معیشت کو حاصل نہیں ہو گا۔

سود کے بجائے شرکت یا مضاربت کے معاہدات کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام بڑی حد تک متوازن ہو جاتا ہے، اور سود کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ کاروبار میں نفع زیادہ ہو تو سارا ایک فریق کی جیب میں جائے، اور نقصان ہو تو وہ بھی ایک ہی فریق پر پڑے، بینکاری کے نظام کو شرکت یا مضاربت کے اصولوں پر استوار کرنے سے معاشی اعتبار سے جو عظیم فوائد متوقع ہیں، ان میں سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ کاروباری منافع زیادہ ہونے کی صورت میں وہ سارا کا سارا سرمایہ داروں کی جیب میں نہیں جائے گا، بلکہ بینکوں کے توسط سے عوام تک پہنچے گا، اس سے سرمائے کے ارتکاز کی روک تھام ہوگی، نچلے طبقے کی آمدنی میں اضافہ ہو گا، منجمد رقوم گردش میں آئیں گی، اور اس کے خوشگوار اثرات پوری معیشت پر مرتب ہوں گے۔

لٰہذا "مشارکہ" یا "مضاربہ" میں یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ ایک خاص حد سے زائد منافع ہونے کی صورت میں زائد منافع بینکوں کو نہیں ملے گا، بلکہ کاروباری فریق ہی کو واپس کر دیا جائے گا، تو شرعاً ناجائز ہونے کے علاوہ اس پابندی کے ذریعے مشارکہ اور مضاربہ کی ساری روح ہی ختم ہو جائے گی۔ سرمایہ دار افراد تو شاید اس تحفظ کے فراہم ہونے سے خوش ہو جائیں، لیکن اسلامی احکام پر عمل کے نتیجے میں تقسیم دولت کے نظام میں جو توازن پیدا ہو سکتا تھا، اس کی راہ بالکل مسدود ہو کر رہ جائے گی۔

خدا کرے کہ "منافع کی شرح متعین" کرنے سے حکومت کی مراد یہ صورت نہ ہو، لیکن اگر مراد یہی ہے تو ہم پوری تاکید کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہ پابندی غیر سودی نظام معیشت کی ساری بساط الٹ کر رکھ دے گی، اس لئے اس تصور کو بالکل منسوخ کیا جائے، البتہ اسٹیٹ بینک کے کنٹرول کو قائم رکھنے کے لئے اس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ فریقین کے درمیان مجموعی منافع کی تقسیم کا تناسب مقرر کر دے۔ یعنی یہ طے کرے کہ منافع کا کتنا فیصد حصہ کونسے فریق کو ملے گا۔

ان تین گزارشات کے ساتھ ہم غیر سودی نظام کے سلسلے میں حکومت کے حالیہ اقدامات اور اعلانات کا خیرمقدم کرتے ہیں، اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو واقعۃً غیر سودی نظام معیشت قائم کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

غیر سودی معیشت کے لئے حکومت کے مجوزہ دوسرے طریقوں کی تفصیل اور وزیر خزانہ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے بارے میں اپنی گزارشات انشاء اللہ ہم کسی آئندہ صحبت میں پیش کریں گے۔

۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۵ھ

محمد تقی عثمانی

و ما علینا إلا البلاغ

ذکر و فکر

نیا بجٹ اور سودی اسکیمیں

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

اس مہینے قومی اسمبلی میں نئے مالی سال کا میزانیہ (بجٹ) پیش ہوا ہے۔ بجٹ کے بہت سے پہلو موضوع بحث بن سکتے ہیں، لیکن اول تو اس پر کماحقہ، تبصرہ کے لئے خاص فنی معلومات درکار ہیں ہیں جن کا نہ ہمیں دعویٰ ہے، اور نہ وہ براہ راست ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، دوسرے اس کے بہت سے پہلو ہمارے مجموعی ڈھانچے سے متعلق ہیں جن پر مفصل بحث کے لئے ایک مستقل مقالے کی وسعت درکار ہے، جو اس وقت پیش نظر نہیں۔

لیکن اس بجٹ کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جو براہ راست ہمارے موضوع سے متعلق بھی ہے، اور اس کے بارے میں سرکاری پالیسی کا عرصے سے انتظار بھی تھا۔

وہ پہلو یہ ہے کہ حکومت نے پچھلے مالی سال کے آغاز میں یہ وعدہ کیا تھا کہ سال رواں میں معیشت کو ربا (سود) کی لعنت سے بالکلیہ آزاد کر دیا جائے گا، اور اس سلسلے میں جس مرحلہ وار پروگرام کا اعلان کیا گیا تھا، اس کی رو سے یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے معیشت کے ہر حصے سے سود کا بالکل خاتمہ ہونا تھا۔ اب نئے بجٹ میں انتظار اس بات کا تھا کہ اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے سرکاری سطح پر کیا اقدامات کئے جاتے ہیں؟

جہاں تک بنکوں کے طریق کار کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہم پہلے بار بار ان صفحات میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ اس کے لئے جو طریقہ وضع کیا گیا ہے، اس میں شرعی نقطہ نظر سے بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں، اسٹیٹ بنک نے سود کے متبادل کے طور پر جو بارہ طریقے وضع

کر کے بنکوں کو ان کا پابند کیا ہے، اس میں بعض طریقے تو شرعاً جائز ہیں، لیکن بعض مشکوک ہیں، بعض صراحۃً ناجائز ہیں، اور بعض سود ہی کی دوسری شکل ہیں، اس کی تفصیل بھی انشاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں عرض کی جائے گی۔

لیکن معیشت کو سود سے پاک کرنے کے لئے دوسرا اہم مسئلہ ان بچت اسکیموں کا تھا جو حکومت کی طرف سے عوام کی بچتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے جاری کی جاتی ہیں، اور ان پر سود دیا جاتا ہے، مثلاً انعامی بانڈز، ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ حکومت اپنے سابقہ اعلان کے مطابق اس بات کی پابند تھی کہ نئے مالی سال سے ان اسکیموں کو بھی سود سے پاک کر کے انہیں شریعت کے مطابق لے آئے۔

حکومت کے سامنے عملی مسئلہ یہ تھا کہ اگر ان تمام اسکیموں سے سود ختم کر دیا جائے، اور ان دستاویزات کے حاملین کو صرف اتنی ہی رقم واپس کی جائے جتنی انہوں نے ان اسکیموں میں لگائی ہے تو لوگ ان اسکیموں میں دلچسپی لینا چھوڑ نہ دیں، اور اس طرح حکومت کے ذرائع آمدنی میں کئی ارب روپے کی جو رقم ان ذرائع سے آتی ہے، وہ بند یا بہت کم نہ ہو جائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ گذشتہ بجٹ کے موقع پر ان اسکیموں کو سود سے پاک کرنے کے لئے ایک سال کی جو مہلت رکھی گئی تھی، وہ اسی لئے تھی کہ اس عرصے میں اس عملی مسئلے کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو شریعت کے مطابق ہو، لہٰذا اب حکومت کے لئے دو ہی راستے تھے، اگر وہ اس عملی مسئلے کا شرعی حل تلاش کر چکی تھی تو ان اسکیموں کے طریق کار میں شریعت کے مطابق ترمیم کرتی اور اگر سال بھر کی مہلت میں وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی طرف توجہ نہیں دے سکی تھی تو کم از کم یہ اعلان کرتی کہ ابھی ان اسکیموں کا متبادل طریقہ وضع کرنے کا موقع نہیں مل سکا، لہٰذا ان اسکیموں کو شریعت کے مطابق بنانے کے لئے کچھ اور مہلت درکار ہے۔

لیکن اس سلسلے میں محترم وزیر خزانہ کے تبصروں کے جو حصے اخبارات میں آئے ہیں انہیں دیکھ کر حیرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اخبارات کی رپورٹنگ کے مطابق انہوں نے فرمایا ہے کہ "ان اسکیموں میں ربا شامل نہیں ہے، اور اس سلسلے میں علماء سے بھی مشورہ کر لیا گیا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ اگر ان اسکیموں میں ربا شامل نہیں ہے تو ایک سال پہلے ان کو سود سے

پاک کرنے کا اعلان کس بنا پر کیا گیا تھا؟ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کونسے علماء ہیں جنہوں نے ان اسکیموں کو سود سے پاک قرار دیا ہے، لیکن اگر کسی نے ان مالی دستاویزات کو مال تجارت قرار دے کر انہیں کمی بیشی سے فروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے تو ساتھ ہی اسے یہ بھی اعلان کر دینا چاہئے کہ اس روئے زمین پر سود کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اور ہر سودی معاملہ قرضے کی دستاویز کو زیادہ قیمت پر فروخت کر کے جائز ہو سکتا ہے۔

نئے وزیر خزانہ نے متعدد مواقع پر اس بات کا اظہار فرمایا تھا کہ وہ سود کو ختم کرنے کے لئے کوئی ایسا طریقہ ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہتے جو محض کاغذی حیلے کی حیثیت رکھتا ہو، اور سود کے متبادل کے طور پر کوئی ایسا طریقہ دریافت نہ کر سکے جو واقعتہً شریعت کے مطابق ہو تو وہ اس کے مقابلے میں صاف صاف یہ کہنے کو پسند کریں گے کہ ابھی سود کو ختم کرنے میں کچھ وقت اور لگے گا۔

اسی لئے ہمیں بجٹ کے اخباری اعلان میں ان اسکیموں کی یہ توجیہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی ہے کہ ان میں ربا کا عنصر شامل نہیں ہے، یہ بات اتنی بدیہی طور پر غلط ہے کہ ابھی تک ہمیں اس میں بھی شبہ ہے کہ محترم وزیر خزانہ کی بات کی رپورٹنگ صحیح بھی ہوئی ہے یا نہیں؟

بہرحال! اگر اخبارات کی رپورٹنگ درست ہے تو یہ بات انتہائی افسوسناک اور شرمناک ہے، کہ سودی اسکیموں کو یہ کہہ کر جاری رکھا جائے کہ ان میں ربا شامل نہیں ہے۔ ابھی بجٹ کے عملی نفاذ میں وقت باقی ہے، اور اگر اس وقت سے فائدہ اٹھا کر اس سنگین غلطی کی اصلاح نہ کی گئی تو یہ اس حکومت کے ماتھے پر بڑا مکروہ داغ ہو گا جس نے اسلام کے نام پر ووٹ لے کر زمام اقتدار سنبھالی ہے، اور جس کی سیاسی وجہ جواز اسلام کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، ہمیں اب تک اس میں بھی شبہ تھا کہ محترم وزیر خزانہ کی بات کی رپورٹنگ کسی حد تک درست ہوئی ہے، بعد میں محترم وزیر خزانہ کا ایک وضاحتی بیان اخبارات میں نظر سے گزرا جس سے اس شبہ کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اسکیموں کی شرعی حیثیت کے بارے میں انہوں نے کوئی حتمی اعلان نہیں کیا، بلکہ اس معاملے کو علماء کی ایک کمیٹی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس دوسری خبر سے سابقہ رپورٹنگ کے سنگین تاثر میں فی الجملہ کمی تو واقع ہوتی ہے، لیکن اصل مسئلے کے بارے میں یہ خبر بھی مجمل ہے، اور اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مستقبل قریب میں ان اسکیموں کی اصلاح حکومت کے پیش نظر ہے یا نہیں؟

ہماری دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ یہ مسئلہ کئی سال سے معلق چلا آرہا ہے، اور اس سلسلے میں سرکاری اعلانات اور اقدامات کے درمیان جو عملی تضاد پایا جاتا ہے، اس نے نفاذ شریعت سے متعلق حکومت کے اعتماد کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ یہ صورت حال کسی بھی حکومت کے لئے مناسب نہیں، چہ جائیکہ وہ حکومت جس کا خمیر ہی نفاذ شریعت کے وعدوں پر اٹھا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو اب جلد از جلد طے ہونا چاہئے، اور اب اس کے لئے طویل المیعاد کمیٹیوں اور کمیشنوں کے بجائے صرف ایسی چند روزہ نشست درکار ہے جس میں وزارت خزانہ اپنے عملی مسائل ملک کے معتمد علماء کے سامنے پیش کرے، اور باہمی غور و فکر اور افہام و تفہیم کے ذریعے ان کا شرعی حل دریافت کیا جائے۔ لیکن اس ایمان و یقین کے ساتھ کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف حرام، بلکہ "خدا اور رسولؐ سے جنگ" قرار دیا ہے، اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے بیٹھیں گے تو انشاء اللہ اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

نئے وزیر خزانہ مالیات و معاشیات میں اپنے گہرے علم اور وسیع تجربے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ملکی مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی ملک کی تقلید کے بجائے جدید راہیں تلاش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اور نئے بجٹ میں اس کے بعض آثار بھی نظر آئے ہیں۔ اگر پاکستان جیسے ملک میں جس کی بنیاد اسلام کے نام پر رکھی گئی ہے، ان کی یہ خداداد مہارت معیشت کو صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالنے پر صرف ہو تو یہ بات ان کے لئے بھی موجب سعادت ہوگی، اور ملک کے لئے بھی فال نیک۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عظیم سعادت سے بہرہ ور ہونے کی توفیق اور اس کی ہمت عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

محمد تقی عثمانی

۱۵ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ

و ما علینا إلا البلاغ

تصانیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

- آسان نیکیاں
- اُندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاستِ حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاحِ معاشرہ
- اصلاحی خُطبات ـــــ (۹ جلد)
- احکامِ اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت و تجارت
- اکابرِ دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہانِ دیدہ ـــــ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرتِ مُعاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیّتِ حدیث
- حضورؐ نے فرمایا ـــــ (انتخابِ حدیث)
- حکیم الامّت کے سیاسی افکار
- درسِ ترمذی ـــــ (۳ جلد)
- دینی مدارس کا نصاب و نظام
- ضبطِ ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علومُ القرآن
- عدالتی فیصلے
- فردکی اصلاح
- فقہی مقالات ـــــ (۳ جلد)
- مآثرِ حضرت عارفی
- میرے والد ۔ میرے شیخ
- ملکیتِ زمین اور اُس کی تحدید
- مُطابقِ سُنّت نماز بخوانید
- نقوشِ رفتگاں
- نفاذِ شریعت اور اُس کے مسائل
- نمازیں سُنّت کے مُطابق پڑھیے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام
- تَکمِلَة فَتحُ المُلْهِم شرح صحیح مسلم ۶ جلد ـــ (عربی)
- مَاهِيَ النَّصرانِيَّة ؟ ـــــ (عربی)
- نَظرةٌ عَابِرةٌ حَول التعليم الإسلامي ـــ (عربی)
- أحكام الأوراق النَّقدِيَّة ـــــ (عربی)
- بحوث في قضايا فقهيه معاصرة ـــ (عربی)

The Authority of Sunnah.
The Rules of I' tikaf.
What is Christianity?
Easy Good Deeds.
Perform Salah Correctly.

فون ۵۰۴۲۲۸۰

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰